إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

نومبر ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد۱۶،شمارہ۱۱ نومبر ۲۰۱۲ء/محرم الحرام ۱۴۳۴ھ

مشمولات

○پاکستانیات

-پاکستان کا اسلامی مستقبل خطرے میں ہے۔دینی عناصر کے لیے لمحۂ فکریہ ۲

-ادھورا سچ -طالبانائزیشن کی ذمہ دار ہماری سیاسی اور عسکری قیادت بھی ہے ۴

- امریکہ کی شکستہ وریخت اور مسلم قوت کا راز مدیر ۷

○جدیدتعلیم

اقبالؒ اور عصری نظامِ تعلیم سید ابوالحسن علی ندویؒ ۹

○دینی مدارس کا نظام تعلیم

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا مرتب کردہ نصاب ڈاکٹر محمد امین ۱۸
ایک تجزیاتی مطالعہ(۲)

○تزکیۂ نفس

دعاء مانگنا سیکھیے احمد جاوید ۲۴

○اسلام اور مغرب

-سائنس مخالفین کی فکری بنیادیں محمد رشید ۲۸

-مسلم معاشرے پر سیکولرازم کے اثرات
اوراہل علم ودانش کی ذمہ داری فضل کریم بھٹی ۳۸

-مغرب کی ذہنی غلامی اور اقبالؒ عابد اقبال ۴۴

○اتحاد بین المسالک

بین المسالک تکفیر غلط ہے ثاقب اکبر ۴۵

○تبصرۂ کتب

توہین رسالت کا مسئلہ اور عمار خان ناصر مدیر ۵۲
ازمولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد

پاکستانیات　　　مدیر

پاکستان کا اسلامی مستقبل خطرے میں ہے

دینی عناصر کے لیے لمحۂ فکریہ

اگر کوئی جاگتے میں خواب دیکھنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے وگرنہ تلخ لیکن نا قابل انکار حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں انتخابی قوت نہیں بن سکیں اور نہ اِس وقت ہیں۔ لے دے کے چند نشستیں جمعیت علماء اسلام (ف) اور چند نشستیں جماعت اسلامی کو مل سکتی ہیں۔

ہمارا سوال ان دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین سے یہ ہے کہ انہوں نے یہ دینی سیاسی جماعتیں کیوں قائم کر رکھی ہیں؟ اگر انہوں نے اپنی لیڈری کے لیے، مالی منفعت کے لیے یا اپنے فقہی مسلک کو زندہ رکھنے کے لیے قائم کی ہیں تو ہمارا انہیں سلام۔ لیکن اگر وہ کہیں کہ ہم نے یہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لیے قائم کی ہیں تا کہ ریاستی قوت سے معاشرے میں اسلامی تعلیمات نافذ کی جاسکیں اور غیر اسلام (یعنی امریکہ و یورپ کی غلامی اور ان کی تہذیب کے غلبے) سے جان چھڑائی جاسکے تو پھر اخلاص اور فراست کا تقاضا ہے کہ آپ مل بیٹھ کر اس کے لیے ایک متفقہ پروگرام تیار کریں☆ اور متحد ہو کر اس کی تنفیذ کے لیے سیاسی جدوجہد کریں۔ اپنے مطالبات دوسری سیاسی جماعتوں کے سامنے رکھیں اور ان میں سے جو آپ کے زیادہ سے زیادہ مطالبات مانے، اس کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیں اور کامیابی ملنے یا نہ ملنے دونوں صورتوں میں اپنے پروگرام اور مقاصد کے لیے جدوجہد جاری رکھیں۔ بنیادی بات یہ نہیں کہ آپ نشستیں کتنی جیتتے ہیں کیوں کہ اتنی نشستیں تو آپ بہر حال نہیں جیت سکتے کہ حکومت بنا سکیں اور اپنی مرضی کے اقدامات کر سکیں لہٰذا اپنے پروگرام کو اہمیت دیں اور اس کی بنیاد پر دوسروں سے اتحاد کریں اور نشستوں کے لیے ایک دوسرے سے نہ لڑیں۔

☆ مجوزہ متفقہ پروگرام تیار کرنا مشکل نہیں کیونکہ دینی سیاسی جماعتوں میں نظری اختلاف کم ہے (سارے دینی مکاتب فکر کا متحدہ پلیٹ فارم 'ملی مجلس شرعی' نفاذ شریعت کے حوالے سے ایک متفقہ دستاویز تیار کر چکا ہے جو طبع شدہ موجود ہے)۔ بنیادی طور پر دو نکات اہم ہیں: ایک فرد اور معاشرے کی اسلامی تناظر میں تعمیرِ نو (اور اس کے لیے 'شریعت بل' یا 'حِسبہ بل' پاس کرنے کی بجائے عملی اقدامات پر زور دیا جائے جیسے نظامِ تعلیم اور میڈیا کی اصلاح اور لوگوں کے دکھوں کو کم کرنا جیسے افلاس، بدامنی اور بے انصافی وغیرہ کا خاتمہ) اور دوسرے امریکی و یورپی غلامی سے نجات اور مغربی فکر و تہذیب کے چنگل سے نکلنا۔

اس وقت دینی سیاسی جماعتوں میں جو اختلاف وکشمکش برپا ہے وہ افسوسناک ہے اور اخلاص و فراست کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ اگر غیر سیاسی بزرگ رہنما اس صورت حال کی اصلاح کے لیے کچھ کر سکیں تو انہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے۔

غیر سیاسی دینی قوتوں کی بے عملی

مساجد و مدارس میں کام کرنے والے علماء کرام اور معاشرے میں دینی کام کرنے والے افراد اور چھوٹے بڑے اداروں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو سیاسی جدوجہد کی مشغولیت نہیں رکھتی۔ دوسری طرف مغرب کی ابلیسی قوتوں نے اپنے ہم نوا حکمرانوں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں مصروف کار افراد اور اداروں کے تعاون سے پاکستانی معاشرے میں بگاڑ کی رفتار اتنی تیز کر دی ہے کہ اخلاقی قدریں روبہ زوال ہیں اور معاشرے میں بے دینی زوروں پر ہے اور تیسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کل افراد معاشرہ (یا جدید اصطلاح میں سول سوسائٹی) ریاسی قوت کے بغیر بھی منظم و متحرک ہو کر فرد کی اصلاح اور اس کے مسائل کے حل کے لیے بہت سے کام موثر اور نتیجہ خیز انداز میں کر سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کی غیر سیاسی دینی قوتیں بھی اس غرض سے کسی پروگرام پر متحد و متحرک نہیں ہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ دن بدن اسلام سے دور ہو رہا ہے۔ لہٰذا اخلاص اور فراست کا تقاضا ہے کہ غیر سیاسی ذہن رکھنے والے علماء کرام اور دینی عناصر مل بیٹھ کر فرد و معاشرے کی اصلاح کے کسی پروگرام☆ پر متفق ہو کر جدوجہد کریں تا کہ پاکستان میں اسلام کے حق میں سیاسی تبدیلی آئے یا نہ آئے کم از کم معاشرتی تبدیلی تو آئے۔ ان دینی عناصر کو اس امر کی بہت فکر کرنی چاہیے کہ اگر پاکستان میں اسلام کے حق میں سیاسی تبدیلی نہ آئی (جس کا امکان بظاہر کم ہی نظر آتا ہے) اور خود انہوں نے بھی اسلام کے حق میں غیر سیاسی معاشرتی تبدیلی کے لیے کچھ نہ کیا تو اس معاشرے اور ملک کا اسلامی مستقبل کیا ہوگا؟

☆ یہ پروگرام کیا ہو سکتا ہے؟ ہم اس پر البرہان میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں (دیکھیے شمارہ مارچ و جولائی ۲۰۱۲ء) ہماری تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے لیے تین نکاتی اصلاحی پروگرام (۱۔تعلیم ۲۔تربیت وتزکیہ ۳۔میڈیا) اور فرد کے مصائب کم کرنے کے لیے بھی تین نکاتی پروگرام (۱۔افلاس کم کرنا ۲۔انصاف مہیا کرنا اور ۳۔امن وامان کی بحالی) پر عمل کرنا چاہیے۔

مدیر

ادھورا سچ

طالبانائزیشن کی ذمہ دار ہماری سیاسی اور عسکری قیادت بھی ہے

پچھلے ہفتے جناب چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری صاحب نے 'قانون کی حکمرانی کے ذریعے امن کا قیام' کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے آخری روز کے اجلاس میں اس موضوع پر ایک فکر انگیز خطبہ دیا۔ اگرچہ ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ اس کانفرنس میں صرف بھارتی جج اور بار کیوں نمایاں رہا اور پاکستان میں وہ کون سے عناصر ہیں جو پاکستان اور بھارت میں شدید اصولی تنازعات کے علی الرغم بھارت کی قانون نوازی اور پاکستان کی مخدوش آئینی عمل داری کو نمایاں کرنا چاہتے اور پاک و ہند کی عدلیہ کو قریب لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ تاہم اس وقت زیر بحث جناب چیف جسٹس کا وہ فکر انگیز خطبہ ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ ''میری رائے کے مطابق تنازعات میں الجھے ہوئے لوگوں کے مابین حقیقی امن مصالحانہ تصفیہ کی بدولت ہی قائم کیا جا سکتا ہے'' اور یہ کہ ''پاکستان آج ایسے حالات کا سامنا کر رہا ہے جہاں امن ایک سہانا خواب لگتا ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اس غمزدہ ریاست کا حصہ خود ہی نہیں بنے بلکہ ہم ماضی میں کئے گئے گناہوں کی قیمت چکا رہے ہیں۔ یہ ایک ناگوار حقیقت ہے کہ عرصہ دراز سے ہم نے اپنے آئین کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جس کا وہ حق دار تھا۔ وہ قومیں جو آئین کی تکریم کرتی ہیں اور اسے حقیقی طور پر رائج کرتی ہیں وہ چیلنجوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور تنازعات کا تصفیہ کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ محققین مشترکہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کامیابی سے آئین توڑنے اور قانون کی حکمرانی سے انحراف نے ہمیں بھٹکایا اور قانون کی حکمرانی کو پاکستان میں نابود کیا ہے اور یہی وہ حالات ہیں جنہوں نے تشدد اور لاقانونیت کی یہ فضا قائم کی ہے جس نے ہمیں عرصہ دراز سے اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے''۔

جناب چیف جسٹس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ''آئینی شقوں سے بہت سے انحرافات نے، جو آج بھی جاری ہیں، قومی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ ماضی میں آئینی انحرافات اور ناتواں قانون کی حکمرانی نے ہی موجودہ دور میں ملک کے کچھ حصوں میں عسکری اور تخریب کارانہ نظریات کو جنم دیا جہاں پر ابھی عسکریت پسندی نے جنم لینا شروع کیا ہے جو بعد ازاں حکومتی رِٹ کے اجراء میں بھی مزاحم ہو سکتی ہے لہٰذا حتمی طور پر ریاست کو ان عسکری تنظیموں کے خلاف کاروائی کرنی

چاہیے لیکن ضروری ہے کہ یہ کاروائی آئین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کی جائے''۔

اس خطبے میں جناب چیف جسٹس صاحب کے اس فرمان سے ہمیں مکمل اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں معاشرے کو امن و امان کے جس فقدان اور جس دہشت گردی اور تشدد کا سامنا ہے اس کی بنیادی وجہ آئین سے انحراف اور قانون پر عمل درآمد نہ کرنا ہے۔ قانونی، منطقی اور فطری طور پر اس مسئلے کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت کو آئین اور قانون پر عمل درآمد کرنا چاہیے تاکہ امن و امان بحال ہو جائے اور تشدد پر آمادہ اور آئین سے منحرف گروہ واپس آئینی دائرہ کار میں آجائیں جیسا کہ انہوں نے اپنے اس یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسا ممکن ہے چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ ''میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر آئین اور قانون کی پاسداری ان کی بنیادی روح کے مطابق کی جائے تو تخریب کاری کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی اور تمام دوسرے مسائل کا بھی خاطر خواہ حل نکل آتا ہے''۔ لیکن حیرت انگیز طور پر انہوں نے اپنی دلیل سے مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنے کی بجائے یہ فرمایا ہے کہ ریاست کو ان عسکری گروپوں کے خلاف آئین کے اندر رہتے ہوئے کاروائی کرنی چاہیے جو تشدد کا سبب ہیں۔

ہمارے فہم کی حد تک پاکستان میں امن و امان کی بُری حالت اور تشدد و دہشت گردی کے دو اصولی سبب ہیں: ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی سبب یہ ہے کہ حکومت قانون پر مؤثر عمل درآمد نہیں کرتی جس کی وجہ سے چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور کرپشن کرنے والوں کو سزا نہیں ملتی حالانکہ ملک میں اسلامی حدود نافذ ہیں۔ ساری دنیا میں جو ملک امن و امان میں بہتری کے حوالے سے سب سے پہلے نمبر پر ہے وہ سعودی عرب ہے کیونکہ وہاں اسلامی حدود نافذ ہیں لیکن پاکستان میں یہ حدود کتابِ قانون میں تو درج ہیں لیکن حکومت ان پر عمل درآمد نہیں کرتی لہٰذا ملک میں جرائم کی کثرت ہے اور امن و امان کی حالت نہایت پتلی ہے۔ اگر حکومت ان قوانین پر مؤثر عمل درآمد کرے تو بہترین نتائج نکل سکتے ہیں۔

تشدد اور دہشت گردی کے خارجی سبب کے دو اجزاء ہیں: ایک پاکستانی طالبان جن کا مطالبہ ہے کہ پاکستان میں شریعت نافذ کی جائے اور اگر حکومت پاکستان نہیں کرتی تو ہم ڈنڈے کے زور سے کرائیں گے۔ ہمیں پاکستانی طالبان کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں ہے کہ اگر حکومت پاکستان ملک میں شریعت نافذ نہ کرے تو انہیں ریاست کے خلاف بغاوت کر کے زبردستی اور اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرنے کا حق ہے۔ ہماری رائے میں پاکستان میں پُرامن طریقے سے شریعت نافذ ہو سکتی ہے کیونکہ یہ آئینی تقاضا ہے [دستور ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۳۱(۱)] لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ حکومت ملک میں شریعت نافذ کر کے طالبان کا یہ مطالبہ پورا کیوں نہیں کر دیتی تاکہ طالبان کے غبارے سے ہوا نکل جائے اور وہ غیر مؤثر ہو جائیں اور آئینی دائرے میں آنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ اگر سکول جلاتے ہیں کہ حکومت ان کی

بچیوں کو غیر اسلامی مغربی تعلیم دے کر بے حیا بناتی ہے تو حکومت پاکستان نظام تعلیم کو اسلامی کیوں نہیں بنا دیتی جب کہ یہ آئینی تقاضا بھی ہے [دستور کی دفعہ ۳۱(۲G)]۔ اگر وہ اسلامی نظامِ عدل کا تقاضا کرتے ہیں تو حکومت ان کا یہ جائز اور آئینی تقاضا پورا کیوں نہیں کر دیتی؟ (حسبِ دفعہ ۲۲۹) اگر وہ میڈیا کی فحاشی اور عریانی کو غلط کہتے ہیں اور سی ڈیز کی دکانیں جلاتے ہیں تو حکومت میڈیا سے فحاشی و عریانی کا خاتمہ کیوں نہیں کرتی جو آئینی تقاضا ہے [(حسبِ دفعہ ۳۷(G)]

طالبان کا رویہ غلط ہے اور غیر آئینی ہے لیکن وہ تو ردِعمل ہے اصل زیادتی اور غلطی بلکہ آئین اور قانون کی اسلامی دفعات پر عمل نہ کرنے کے جرم کی مرتکب تو حکومتِ پاکستان ہو رہی ہے جو ان دفعات پر مخلصانہ عمل نہیں کر رہی اور جس کے ردِعمل میں طالبان سامنے آئے ہیں۔ لہٰذا ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس تشدد اور دہشت گردی کی ذمہ دار حکومت پاکستان ہے۔ اسے آئین کی اسلامی دفعات پر مخلصانہ عمل کرنا چاہیے تاکہ طالبان کا مطالبہ ہی ختم ہو جائے اور وہ غیر مؤثر ہو کر آئینی عمل داری میں آ جائیں اور انہیں ہتھیار اٹھانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

ملک میں تشدد اور دہشت گردی کی دوسری بڑی خارجی وجہ امریکہ و یورپ کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ اور حکومت پاکستان کا اس کی حمایت کرنا ہے۔ یہ بھی دستور کی خلاف ورزی ہے کیونکہ دستور پاکستان کی خارجہ پالیسی کو مسلم ممالک سے دوستی پر استوار کرنے کا حکم دیتا ہے (دفعہ ۴۰) جب کہ حکومت پاکستان افغانستان کے خلاف امریکہ و نیٹو کی حمایت کرتی ہے۔ آئین ملکی سرحدوں کو تقدس عطا کرتا ہے لیکن حکومت ڈرون حملوں کے خاتمے اور شمالی علاقوں اور بلوچستان میں امریکی و بھارتی مداخلت کاروں کو روکنے کے لیے کوئی کاروائی نہیں کرتی اور پارلیمنٹ کی طرف سے دو دفعہ امریکہ و نیٹو کے خلاف قراردادیں منظور کرنے کے باوجود امریکی غلامی سے باز نہیں آتی۔ ایک آدمی ناجائز اور بہیمانہ قتل ہو جائے تو میڈیا شور کرتا اور عدالت سوموٹو ایکشن لیتی ہے لیکن یہ حکومت ۴۰ ہزار آدمی مروا چکی ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ چند لاکھ کی کرپشن پر بھی میڈیا اور عدالت حرکت میں آتے ہیں جو بہت اچھی بات ہے لیکن حکومت پاکستان کھربوں روپے کا نقصان دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں کر چکی ہے اور لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری کس کے سر ہے؟

آخر میں ہم دوبارہ جناب چیف جسٹس آف پاکستان کے مؤقف کی حمایت کرتے ہیں کہ امن کی کنجی آئین و قانون کی عمل داری میں ہے لہٰذا حکومتِ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ آئین و قانون پر عمل کرے تا کہ ملک سے تشدد اور دہشت گردی کا خاتمہ ہو سکے۔

مدیر

امریکہ کی شکستہ وریخت اور مسلم قوت کا راز

امریکہ کی بیس ریاستوں نے وفاق سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ امریکہ کے ٹوٹنے کی ابتداء ہو چکی ہے۔ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا کی ایک سپر پاور (روس) اور اس کے نظریے (کمیونزم، سوشلزم) کو توڑنے کا سبب افغانی مسلمان بنے اور اب دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کے ٹوٹنے کی ابتداء ہوئی ہے تو اس کا سبب بھی افغانی مسلمان ہیں؟ سوال یہ ہے کہ افغانی مسلمانوں کی اس طاقت کا راز کیا ہے؟ جدید ٹیکنالوجی سے وہ محروم ہیں بلکہ ان کے ہاں تو سرے سے تعلیم ہی موجود نہیں، نہ ان کے ہاں سیاسی و معاشی استحکام ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ پچھلی دفعہ وہ اس لیے جیت گئے کہ امریکہ و یورپ اور پاکستان و مسلم دنیا کی حمایت انہیں حاصل تھی لیکن اس دفعہ تو وہ امریکہ و یورپ کی متحدہ طاقت کے خلاف لڑ رہے تھے اور پاکستان اور مسلم دنیا کا وزن بھی ان کے خلاف تھا۔ اس کے باوجود وہ جیت گئے ہیں اور امریکہ نہ صرف افغانستان سے نا کام ہو کر بھاگنا چاہ رہا ہے بلکہ داخلی طور پر اس کے ہاں شکست و ریخت کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ آخر افغانی مسلمانوں کی اس قوت کا راز کیا ہے؟

اس کا ایک ہی معقول جواب ہے اور وہ ہے ان کا جذبۂ ایمانی جس کے نتیجے میں وہ اپنا تن من اور دھن اللہ کی راہ میں لٹا دینے پر بخوشی آمادہ ہو جاتے ہیں اور کفار کی اطاعت پر ان کے دل راضی نہیں ہوتے۔ یہودی اور امریکی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر خودکش حملوں کی مذمت کرنا آسان ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک آدمی اس دنیا میں اپنی سب سے بڑی متاع یعنی اپنی جان بھی قربان کر دے، یہ معمولی بات نہیں۔ اس کا محرک صرف جذبۂ جہاد ہے یعنی اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دینا۔

سوال یہ ہے کہ افغانیوں میں یہ جذبۂ ایمانی اور جذبۂ جہاد کیسے باقی ہے جب کہ باقی دنیا کے مسلمانوں میں اور خود پاکستانیوں کی اکثریت میں یہ موجود نہیں؟ اس کا جواب اصلاً تو ایک ہی ہے لیکن اس کے پہلو کئی ایک ہیں مثلاً

- افغان معاشرے نے اپنے کلچر میں وہ اسلامی روح برقرار رکھی ہے جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور حاصل ہے۔
- اس روح کے برقرار رہنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے کفر والحاد پر مبنی مغربی تہذیب کے اثرات قبول نہیں کیے۔

۔ اس کی ایک وجہ ہے افغانوں کی غربت اور جفاکشی اور مروجہ شہری سہولتوں اور آسائشوں سے محرومی اور تن آسانی سے دوری کہ بقول اقبال ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی

اس سے مسلمان عموماً اور ہم پاکستانی خصوصاً کیا سبق سیکھ سکتے ہیں؟ یہ کہ اپنے جذبۂ ایمانی کی حفاظت کی جائے اور مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے بچا جائے۔ اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے نظام تعلیم وتربیت۔ ہمیں اور ہماری نسلوں کو نامسلمان بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہمارا مغرب زدہ نظام تعلیم وتربیت ہے اور ہماری آئندہ نسلوں کو صاحب ایمان اور یکسو اور باعمل مسلمان بنانے کا بنیادی نسخہ یہ ہے کہ ہم اپنے نظام وتربیت کی اصلاح کریں، اسے مغربی فکر وتہذیب کے الحادی اثرات سے بچائیں اور اس کی اسلامی تشکیل نو کریں۔ البرہان اسی کا علم بردار ہے اور اس کے اکثر مضامین اسی کی وضاحت کرتے ہیں۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام.. پتہ..

فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

جدید تعلیم

سید ابوالحسن علی ندویؒ

اقبالؒ اور عصری نظامِ تعلیم

اقبال نے جب اپنی بصیرت سے جدید نظام تعلیم کا جائزہ لیا تو انہیں چند بڑی کمزوریاں اور خامیاں نظر آئیں جنہیں انہوں نے اپنی تنقید اور صاف گوئی کا نشانہ بنایا اور ماہرین تعلیم کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی۔ وہ جہاں مدرسہ اور طالب علم کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس سے مراد مغربی مدارس اور اس کے طلبہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کے حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے۔ وہ مدرسہ و خانقاہ دونوں سے بیزار نظر آتے ہیں جہاں پہ زندگی کی چہل پہل ہے نہ محبت کا جوش وخروش، نہ حکمت و بصیرت ہے نہ فکر ونظر ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

وہ دانشکدوں کی کور نگاہی، بے ذوقی اور خانقاہوں کی کم طلبی و بے توفیقی دونوں سے نالاں اور دونوں سے گریزاں ہیں ؎

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب وتہی کدو

عصری دانشگاہوں کا ظلم عظیم

اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے اعتناء اور قلب وروح کی نشوونما، روحانی ارتقاء اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت کر کے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا، جس کے سبب اس کے قویٰ غیر متوازن، اور اس کی اٹھان غیر متناسب ہوئی ہے اور اس کی زندگی ہم آہنگی کے بجائے بے اعتدالیوں کا نمونہ بن آئی ہے۔ نئی نسل کے ظاہر وباطن، عقل وروح، علم وعقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہوگئی ہے۔ اس کی عقل باریک مگر روح تاریک ہے اور اس کے ذہنی ارتقا کے ساتھ اس کا روحانی زوال بھی اسی حساب سے ہو رہا ہے۔

وہ نئی نسل کو بہت قریب سے جانتے تھے اس لیے جب بھی وہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے یا کوئی بات کہتے ہیں تو وہ امر واقعہ کی تصویر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کا پیمانہ خالی، اس کی روح پیاسی اور تاریک ہے مگر اس کا چہرہ بہت تازہ و بارونق اور اس کا ظاہر بہت چاق وچوبند ہے۔ اس کی عقل

روشن مگر بصیرت اندھی ہے، بے یقینی اور یاس وقنوط ان کی زندگی کا حاصل اور محرومی ان کی قسمت ہے۔ یہ نوجوان انسان نہیں انسانوں کی لاش ہیں۔ وہ اپنی ذات کے منکر ہیں مگر دوسروں پر ایمان لاتے ہیں۔ اغیار روا جانب ان کے اسلامی خمیر سے دیر وکلیسا کی تعمیر کر رہے ہیں، اوران کی صلاحیتیں ''صَرف درمیکدہ'' ہو رہی ہیں۔ سخت کوشی اور جفاکشی کی بجائے نرمی اور تن آسانی، لذت طلبی اور عیش کوشی ان کا مسلک بنتی جا رہی ہے۔ ان کی پست ہمتی کا یہ حال ہے کہ امیدیں اور آرزوئیں پیدا ہی نہیں ہوتیں یا پیدا ہوتے ہی گھٹ کے مرجاتی ہیں۔ نئی دانشگاہوں نے ان کے دینی جذبات کو پوری طرح سلا دیا ہے اوران کے وجود کو ہم نفس عدم بنا دیا ہے۔

اپنی ذات اور اپنی شخصیت سے ناواقف اور اپنی صلاحیتوں سے بے پروائی ان میں عام ہے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر وہ اپنی روح کا سودا روٹی کے چند ٹکڑوں پر بھی کرتے اور ضمیر فروشی کر سکتے ہیں۔ ان کے معلم بھی ان کی قیمت اور حیثیت عرفی سے نا آشنا ہیں اس لیے انہوں نے ان کو شرف وعظمت کے راز سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ مومن ہیں لیکن موت کی لذت سے بے خبر اور توحید کی طاقت سے ناواقف ہیں۔ وہ فرنگ سے تہذیب کے لات ومنات کی درآمد کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے اور فرزندِ حرم ہو کر بھی ان کا دل ''طواف کوئے ملامت'' اور ''سجدہ پائے صنم'' سے متنفر نہیں۔ فرنگ نے انہیں بغیر حرب وضرب اور قتل وغارت کے مار ڈالا ہے۔ ان کی عقلیں بے جھجک، ان کے دل پتھر اور نگاہ بے باک ہے۔ ان کے قلوب بڑے سے بڑے حوادث کی چوٹ سے بھی نہیں پگھلتے اوران کے علم وفن، دین وسیاست، عقل ودل، سب کا مرکز مادہ ہے۔ ان کے دلوں میں افکار تازہ کی کوئی نمود نہیں، ان کے خیالات میں کوئی بلندی نہیں اوران کی زندگی پر جمود وتعطل کی برف جمی ہوئی ہے ؎

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدائے لا الٰہ الا اللہ

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذّتِ اسرار بھی ہے؟

مئے یقین سے ضمیرِ حیات ہے سوز

نصیبِ مدرسہ یا رب یہ آبِ آتشناک!
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن ودل تیرہ ونگہ بے باک

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ
شستہ رو تاریک جاں، روشن دماغ

کم نگاہ و بے یقین و ناامید
چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

ناکساں منکر ز خود مومن بغیر
خشت بند از خاک شاں معمارِ دیر

اقبال نئی نسل کے نوجوانوں سے کیا توقعات اور ان کے متعلق کیسے بلند خیالات رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اشعار سے ہوسکتا ہے ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ایک قطعہ میں کہتے ہیں ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے		پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے		مرا نورِ بصیرت عام کردے

خطاب بہ نوجوانان اسلام اور دوسری نظموں میں ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔طلباعلی گڑھ کالج کے نام ''عشق کے دردمند'' نے اپنے پیغام میں صاف صاف کہا ؎

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

ان کی نظم ''ایک نوجوان کے نام'' میں ان کے احساسات بڑی وضاحت سے آگئے ہیں ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم وعرفاں ہے
امیدِ مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ جب مسلم نوجوانوں کو اسلام کی بجائے دوسرے فلسفوں سے متاثر اور مرعوب دیکھتے ہیں تو فطری طور پر انہیں صدمہ ہوتا ہے۔ اپنی نظم ''ایک فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام'' میں کہتے ہیں ؎

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناریٔ برگساں نہ ہوتا
انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دیں مسلک زندگی کی تقویم — دیں سرِّ محمدؐ وابراہیم
دل در سخن محمدؐ بند — اے پور علیؓ ز بو علی چند
چوں دیدہ راہ بیں نداری — قائد قرشیؐ بہ از بخاری

اقبال نئی نسل کی بے ہمتی اور اس کی اخلاقی پستی کا ذمہ دار موجودہ نظام تعلیم کو قرار دیتے ہیں۔ جس کے ہاں اخلاق پر کوئی زور نہیں اور نہ تربیت کا کچھ خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں کے دل سوز دروں سے خالی اور ان کی نظریں غیر عفیف ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زبان بہت تیز ہے، لیکن ان کی آنکھوں میں اشک ندامت اور دل میں خوف وخشیت ذرا بھی نہیں ؎

جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پر کار وسخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

وہ ان سب باتوں کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے، اوران کی فطرت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ دوسرا ذمہ دار وہ حد سے بڑھی ہوئی ''عقلیت'' کو بھی سمجھتے ہیں جو اولوالعزمیوں اور پُر خطر راہوں سے روکتی، اور ہر قدم پر مصلحت سنجی اور عافیت بینی کا بہانہ تراشتی رہتی ہے۔

اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی، اسباب طلبی اور عہدوں، ملازمتوں، اوراونچی کرسیوں کو تعلیم کے مقاصد سمجھنا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بے مقصد افراد کے لیے علم دوائے نافع نہیں سم قاتل وقاطع ہے اور ایسے رزق سے موت بہتر ہے ؂

اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مغربی تعلیم پر معاد کی بجائے معاش کا تصور جس طرح چھایا رہتا ہے وہ اس کے لیے جان لیوا ہے۔ اس تعلیم کا یہ فیض ہے کہ مرغ چمن محروم نوا اور فطرت بے رنگ ہوکر رہ جاتی ہے۔ وہ روٹی بھی ہاتھ میں نہیں تھماتی اور دوسرے ہاتھ سے روح بھی قبض کر لیتی ہے ؂

نوا از سینۂ مرغِ چمن برد
ز خوں لالہ آں سوزِ کہنِ برد

بایں مکتب بایں دانش چہ نازی
کہ ناں در کف ندارد جاں ز تن برد

جدید تعلیم کے مجرمانہ کردار کا اقبال نے بے باکی سے پردہ چاک کیا اوراس کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔ حد سے زائد فکر معاش، ناروا مصلحت بینی، عافیت کوشی، مصنوعی تہذیب اور نقلی زندگی اس تعلیم کی نمایاں پیداوار ہیں۔ اقبال نے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے ؂

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بے گانہ کیا
جو کہتا تھا خرد سے بہانے نہ تراش

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا

جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

نئی تعلیم پر اقبال کے غم وغصہ اور سخت گیری کی ایک بنیاد یہ ہے کہ یہ تعلیم بطالت وتعطل، جمود وخمود، آرام طلبی ولذت کوشی کی تعلیم دیتی ہے اور زندگی کو بحر منجمد بنا دیتی ہے۔ وہ طالب علم کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اسی طرح یہ تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب، اس کے افکار اور اس کے مستقبل کے لیے نو آبادیات کی زمین فراہم اور ہموار کرتی ہے، اور نوجوانوں کو افرنگ زدہ بناتی ہے اور بلند معیار زندگی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل سامنے لاتی ہے نیز مشرق کی روایات وخصوصیات کو ختم کر کے وہاں وہ مغربی معاشرہ برپا کر دینا چاہتی ہے، جہاں بقول میکالے شکل وصورت کے لحاظ سے مشرقی لیکن ذہن وطبیعت کے اعتبار سے مغربی انسان پائے جانے لگیں۔

مغربی تعلیم پر اقبال کی تنقیدوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس طرح اس کی بنیاد کفر والحاد یا پھر ذہنی انتشار اور فکری انارکی پر ہے اسی طرح وہ یہ تمام ذہنی بیماریاں نئے دماغوں میں اتار دیتی ہے۔ فکر وفلسفہ، آزادیٔ رائے، حریت خیال اور آزادانہ غور وخوض کے نام سے ذہنی بے ربطی اور پریشان خیالی کو جنم دیتی ہے۔ اقبال کے خیال میں غلط بینی سے کور چشمی اور عالمانہ بے دینی سے نادانی بہتر ہے ؎

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے — ز بینائے غلط بینے نکو تر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش — ز دانشمند بے دینے نکو تر

اقبال کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ ان ذہنی جمناسٹکوں سے کیا حاصل جو انسان کو خلا باز اور ہوا پرواز بنا دیں لیکن اس کے جمے ہوئے قدم بھی اکھڑ جائیں اور وہ اپنا مقام بھی کھو بیٹھے ؎

ازاں فکرِ فلک پیما چہ حاصل — کہ گرد ثابت و سیارہ گردد
مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد — بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

یہ نظام تعلیم انسان کو مشینوں، صنعتوں اور ترقیوں کے آگے بے قیمت وبے حیثیت بنا دیتا ہے

حالانکہ انسان ہی بحر وجود کا گوہر مقصود اور مزرع ہستی کا حاصل ہے۔ دنیا کو انسان کے تابع ہونا چاہیے نہ کہ انسان کو دنیا اور متاع دنیا کے ؎

منہ از کف چراغ آرزو را　بدست آور مقامِ ہائے وہو را
مشو در چار سوئے ایں جہاں گم　بخود بار و بشکن چار سو را
دو گیتی را بخود باید کشیدن　نباید از حضورِ خود رمیدن
بہ نورِ دوش بیں امروز خود را　ز دوش امروز نتواں ربودن

اس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق
تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

اقبال کی نظر میں فکرِ بشری وحی الٰہی اور فیضان سماوی کے بغیر خام اور ناتمام رہتی ہے۔ اس لیے فکری پختگی کے بغیر اسے شروع سے آزاد اور بے قید کر دینا پریشاں خیالی اور ژولیدہ نگاہی کو دعوت دینا ہے۔ ’آزادیٔ فکر‘ کے عنوان سے انہوں نے ایک بڑا بصیرت افروز اور معنی خیز قطعہ کہا ہے ؎

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر وتدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

مشرق میں ناپختہ افکار و فلسفہ نے جو وبائی شکل اختیار کر لی ہے اور غیر ہضم شدہ خیالات نے جس طرح دنیا میں ذہنی بے اطمینانی پیدا کر دی ہے وہ بھی کالج کا عطیہ ہے جو ہر نئی ذہنی اپج کو فلسفہ کا نام دے دیتا ہے ؎

پر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

’’عصر حاضر‘‘ کے عنوان سے اقبال نے ایک قطعہ میں مشرق ومغرب کی بنیادی خرابیوں کو طشت از بام کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشینی دور کی تیز روی اور عجلت پسندی نے ہر شے کی پختگی ختم کر دی ہے اور

فلسفہ کو بے ربط بنا دیا ہے۔ دیارِ فرنگ میں عشق و محبت کو ان کا حقیقی مقام اسی لیے نہیں ملا کہ لادینیت نے اس کا کوئی مرکز باقی نہیں چھوڑا اور مشرق میں عقل کو صحیح مقام اس لیے نہیں ملا کہ افکار میں کوئی تسلسل نہ تھا۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربطِ نظام

مردہ لا دینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

نظامِ تعلیم پر اقبال کی تنقید کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں میں مغرب کی اندھی تقلید اور خالص پیروی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور ان میں جدت و اجتہاد کا کوئی جذبہ نہیں بیدار کرتا۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا تو خود رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے لیکن یہ دانش گاہیں اس سے بھی تنگ دائروں میں بند ہیں ان میں جا کر عبقری دماغ بھی امامت عصر کی بجائے ابن الوقتی اور زمانہ سازی کرنے لگتے ہیں ؎

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں　　　بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار　　　کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ ودو
کرسکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت　　　وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

اقبال کہتے ہیں کہ نئی نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں بلکہ وہ یورپ کی پرچھائیں ہے اور اس کی مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے۔ نئی نسل جسم و مادہ کا وہ ڈھانچہ ہے جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے لیکن اس میں روح نہیں پھونکی۔ اس کا وجود وہ مرصع نیام ہے جس میں کوئی تیغ قاطع نہیں۔ اقبال بڑے مزے سے کہتے ہیں کہ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے لیکن میری نظر میں خود اس نسل ہی کا بود و وجود ہم نفس عدم ہے ؎

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی

فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اقبال کی رائے ہے کہ مغربی نظام تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچلنے کی پوری کوشش کی ہے اور انہیں مردانِ کار کی بجائے مرد بیمار بنا دیا ہے اور بانکا سجیلا، صباحت پسند بن کر رہنا سکھا دیا ہے۔ ان میں نزاکت وملاحت، نرمی اور تخنث اور نسائیت پیدا کر کے جدوجہد کی سرگرمیوں سے بہت دور کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری نظر میں اس علم کی کوئی قیمت نہیں جو مجاہد سے اس کے مردانہ اوصاف چھین لے اور مصاف زندگی میں اسے سامان آرائش دے کر اس کے ہتھیار لے لے۔

اقبال بڑی دردمندی اور جاں سوزی کے ساتھ پر خلوص انداز میں نئی نسل کے مربی سے درخواست کرتے ہیں، وہ جب ایک شفیق استاد اور مہربان وغمخوار مربی کی زبان سے یہ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں اور پوری ملت کا غم ان کے وجود میں سمٹ آیا ہے ؎

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

کہہ جاتا ہوں میں زورِ جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

دینی مدارس کا نظام تعلیم

ڈاکٹر محمد امین

مولانا مدنی ؒ کا مرتب کردہ نصاب
ایک تجزیاتی مطالعہ (دوسری قسط)

نصاب اور نصابی کتب

دینی مدارس والے نصاب (Curriculum) اور نصابی کتب (Text books) میں بالعموم فرق نہیں کرتے بلکہ نصاب کا لفظ نصابی کتب کے لیے استعمال کرتے ہیں جب کہ جدید اصطلاح میں نصاب سے مراد یہ طے کرنا ہے کہ کیا پڑھایا جائے گا یعنی مواد تدریس کا تعین اور پھر اس نصاب کے مطابق نصابی کتب کی تیاری یا انتخاب کا مرحلہ آتا ہے۔علوم کی تقسیم میں بھی اسلامی روایت اور آج کل کی رائج مغربی تعلیم کے تصورات میں فرق ہے۔اسلامی روایت میں علم سے مراد ہے علم وحی یعنی قرآن وسنت اور دیگر علوم (Disciplines) جن میں عقل ومہارت کا دخل ہو انہیں فنون کہا جاتا ہے یا علوم آلیہ یعنی وہ علوم جو بنیادی علم سے براہ راست متعلق ہوں جیسے عربی زبان، اسلامی فقہ، تاریخ وغیرہ۔انہیں معاون علوم بھی شمار کرلیا جاتا ہے۔مغربی تہذیب کے تعلیمی تصورات میں علوم کی دو بڑی تقسیمات ہیں: عمرانی یا سماجی علوم (جیسے تاریخ، فلسفہ، معاشیات وغیرہ) اور خالص سائنسی علوم (جیسے ریاضی، کیمیا، طبیعیات وغیرہ)۔مذہب اور لسانیات سماجی علوم کا ایک جزو گردانے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جدید یونیورسٹیوں میں شعبۂ علوم اسلامیہ عموماً فیکلٹی آف سوشل سائنسز کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

بہر حال اس تمہید کے بعد عرض یہ ہے کہ مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کا مرتب کردہ نصاب ایک جامع نصاب ہے جس میں مرکزی حیثیت قرآن وحدیث کو دی گئی ہے جنہیں وہ بنیادی علوم میں شمار کرتے ہیں۔معاون علوم میں، جنہیں وہ اکثر فنون کہتے ہیں، تمام اہم عمرانی اور سائنسی علوم شامل ہیں۔لسانیاتی پالیسی کو وہ الگ بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد دنیاوی مہارتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ہم اسی ترتیب سے ان کے مرتب کردہ نصاب کی کچھ تفصیلات آپ کے سامنے رکھتے ہیں:

قرآن وحدیث

جیسا کہ معروف ہے کہ ملا نظام الدین سہالویؒ نے درس نظامی کے نام سے جو نصاب ترتیب دیا تھا

اس میں قرآن وحدیث کومرکزی حیثیت حاصل نہ تھی۔اس میں یہ حکمت پیش نظر رکھی گئی تھی کہ قرآن و حدیث کی ایک ایک کتاب (بیضاوی اور مشکوٰۃ) پڑھا کرعربی زبان اور معاون اسلامی علوم و دنیوی علوم میں انہیں طاق کر دیا جائے تا کہ فارغ التحصیل ہوکر جب وہ مسلم ریاست اور معاشرے کے مفید رکن بن جائیں اور باروزگار ہوجائیں تو ان کی علمی بنیادیں اتنی مضبوط ہوں کہ مزید علم کا حصول یا تطبیقی مرحلہ ان کے لیے آسان ہو۔مولانا مدنیؒ اس حکمت یا پالیسی کو رد کر دیتے ہیں،اسے عیب گردانتے ہیں اورقرآن و حدیث کو اپنے نصاب میں مرکزی حیثیت دیتے ہیں (اصول وقوانین کلیہ ۱۰)۔

من جملہ دوسرے دلائل واسباب کے مولانا کے موقف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب مسلم حکومت موجود نہ تھی اور انگریز کی استعماری حکومت کے لیے کارکن تیار کرنا انہیں درکار نہ تھا۔جب سرکاری ملازمتیں میسر نہ تھیں تو ان کا رجحان یہ ہوا کہ طلبہ اسلامی علوم تو جم کر پڑھیں لیکن روزگار کے لیے وہ ایسی مہارتیں حاصل کرلیں جواس وقت کے معاشرے کے ماحول اورضرورت کے مطابق انہیں روزگار مہیا کر سکیں۔اس حکمت اور اصول کے مطابق مولانا نے قرآن وحدیث کو بنیادی علوم قرار دیتے ہوئے جو کتابیں تجویز کیں وہ یہ تھیں:

قرآن وعلوم القرآن

تین سالہ پرائمری میں ناظرہ قرآن کی تکمیل وتجوید کی مشق۔مولانا کا اصرار ہے کہ بچوں کوقرآن پڑھانے والا قاری ماہر تجوید ہونا چاہیے تا کہ بچوں کے مخارج ابتداء ہی سے درست ہوجائیں۔پانچ سالہ ثانویہ کے پہلے چار سالوں میں ترجمۂ قرآن حضرت شیخ الہندؒ کی تکمیل اور چوتھے و پانچویں سال میں 'موضح القرآن از شاہ عبدالقادرؒ۔۸ سالہ مرحلۂ عالیہ میں تین تفسیریں یعنی تفسیر عزیزی، جلالین اور بیضاوی مع الفوز الکبیر اصول تفسیر میں۔

حدیث وعلوم الحدیث

۱۔سیرۃ النبیؐ: ابتدائیہ کے دوسرے سال میں سیرۃ النبیؐ میں رسالہ 'ہمارے نبیؐ' اور سال سوم میں 'خاتم الانبیاؐء۔اسی طرح ثانویہ کے پہلے سال میں 'رحمۃ للعالمین' جلد اول۔عالیہ کے سال خامس میں شمائل ترمذی اور قاضی عیاض کی الشفاء۔

۲۔متون حدیث: عالیہ کے سال اول میں چہل حدیث از مولانا اصغر حسین دیوبندی و اربعین نووی۔سال ثانی وثالث میں اعلاء السنن وکتاب الآثار للامام محمد۔سال چہارم میں مؤطا امام محمد، سال سادس

میں مشکوٰۃ المصابیح اور سال سابع میں ترمذی، مسلم اور ابن ماجہ جب کہ سال ثامن میں بخاری، ابوداؤد، نسائی اور شرح معانی الآثار۔

۳۔اصول حدیث: عالیہ سال خامس میں شرح نخبۃ الفکر۔ سال سادس میں الفیۃ العراقی فی اصول الحدیث

تفصیل بالا سے ظاہر ہے کہ مولانا کے تجویز کردہ نصاب میں نہ صرف قرآن وحدیث کا مواد زیادہ ہے بلکہ دیوبند اور اس کے تتبع میں کام کرنے والے اکثر پاکستانی مدارس میں عالمیہ کے آخری سال میں دورۂ حدیث (یعنی مرور سریع جس میں تحقیق وتدبر کا موقع کم ملتا ہے) کے تصور کے بھی خلاف ہے اور انہوں نے مطالعۂ متن حدیث کو مختلف مراحل میں پھیلا دیا ہے تاکہ متون کتب حدیث کا سنجیدہ مطالعہ کیا جا سکے۔

اسلامیات: (قرآن وحدیث، سیرت وفقہ اور سوانح کے علاوہ عقیدہ وکلام وغیرہ) پرائمری سال اول: وضو اور نماز کی عملی تعلیم۔ قاعدہ تعلیم الاسلام وتعلیم الاسلام ا، مع کتابت۔ سال ثانی: تعلیم الاسلام ۲۔ سال ثالث: تعلیم الاسلام ۳، ۴۔ ثانویہ سال ثالث ورابع: عقائد اسلام مصنفہ حقانی۔ عالیہ سال اول کتاب الصلوٰۃ از ملتقی الابحر۔ سال خامس شرح عقائد نسفی وشرح نخبۃ الفکر۔ سال سادس شرح عقیدہ طحاویہ۔ سال سابع: حجۃ اللہ البالغہ۔

معاون اسلامی علوم/فنون: ان میں مندرجہ ذیل عمرانی علوم شامل تھے:

تاریخ: ثانویہ کے سال ثانی میں تاریخ الامہ (عرب قبل از اسلام۔ سال ثالث میں تاریخ الحریہ فی الاسلام از محمد دین فوق، سال رابع میں تاریخ الاسلام ۴، سال خامس میں تاریخ سندھ قدیم وتاریخ الامہ۔ عالیہ کے سال اول میں فصول اکبری، تاریخ سلاطین ہند عہد اسلام از اکبر خان نجیب آبادی وتاریخ حروب صلیبیین از شرر لکھنوی۔ سال دوم: تاریخ آل عثمان از مولوی انشاء اللہ خاں۔ سال ثالث میں آئینۂ حقیقت نما از اکبر خاں نجیب آبادی وتاریخ اندلس وسپین۔ سال رابع میں تاریخ ترکیہ جدیدہ اور سلطان نورالدین محمود۔ سال خامس میں آئینہ حقیقت نما، تاریخ افغان جدید۔ ہندوستان در عہد اورنگ زیب از مرزا سمیع اللہ بیگ، آزادئ ہند مصنفہ انڈریوز، کشف الغمہ عن جمیع الامہ للشعرانی۔

تاریخ کے اس بھاری بھر نصاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مدنیؒ تاریخ قدیم وجدید کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

جغرافیہ: ابتدائیہ کے تیسرے سال میں صوبے کا جغرافیہ، ثانویہ سال اول میں جغرافیۂ ہند مع نقشہ، سال

سوم میں جغرافیہ ایشیا مع نقشہ۔

قانون (فقہ واصول فقہ): ثانویہ سال اول میں رسالہ علم الفقہ ۱، ۲ از مولانا عبدالشکور۔سال ثانی میں علم الفقہ ۲، ۳۔سال ثالث میں علم الفقہ ۴، ۵۔عالیہ کے سال دوم میں اصول شاشی ۔سال ثالث میں نورالانوار کامل وشرح نقایہ لملاعلی قاری یا شرح وقایہ نصف اول۔سال رابع میں توضیح کامل و ہدایہ اولین۔ سال خامس میں ہدایہ آخرین وفواتح الرحموت۔سال سادس میں بقیہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت۔ سال سابع میں بدایۃ المجتہد لابن رشد [تقابلی مطالعہ] اور سال ثامن میں دستور انگلستان [تقابلی مطالعہ]

منطق وفلسفہ: ثانویہ کے سال رابع میں تیسیر المنطق۔خامس میں ایساغوجی وقال اقول۔عالیہ سال دوم میں قطبی تصدیقات۔سال ثالث: قطبی تصورات معہ میر۔سال رابع: سلم العلوم۔

معاشیات: ثانویہ کے سال رابع میں کنگال ہندوستان۔سال خامس میں مظلوم کسان۔عالیہ کے سال ثالث ورابع میں معاشیات ہند للبرنی

سوانح: ثانویہ سال اول: اورنگزیب از شبلی نعمانی، سال ثانی: حیاۃ سلطان صلاح الدین مصنفہ حکیم احمد حسین، سال رابع میں الفاروق از شبلی نعمانی اور سال خامس میں سیرۃ عمر بن العزیز وسیرۃ النعمان۔عالیہ کے سال سادس میں اسوۂ صحابہ از عبدالسلام ندوی۔

سیاسیات: عالیہ سال اول: گوکھلے کی تقریریں۔سال خامس میں اصول سیاست از اجمل خاں۔سال سادس وسابع میں اصول السیاسہ از لی کاک اور سال ثامن میں دستور انگلستان۔علم سیاست کے اس براہ راست مطالعے کے علاوہ تاریخ قدیم وجدید کا مطالعہ بھی سیاسی معرفت مہیا کرتا ہے۔

تقابل ادیان و مذاہب (مناظرہ): عالیہ سال۔رابع: رشیدیہ فی المناظرہ۔سال خامس میں مطالعۂ عیسائیت، سال سادس میں مطالعہ ہندومت (آریہ)۔سال سابع میں مطالعۂ قادیانیت واہل تشیع۔

سائنسی مضامین

ریاضی: پرائمری سال اول میں گنتی لکھنا اور یاد کرنا اور دس تک پہاڑے۔سال ثانی میں جمع، تفریق، ضرب، تقسیم بسیط۔سال ثالث میں، جمع تفریق ضرب تقسیم بسیط ومرکب۔ثانویہ سال اول: مقسوم علیہ اعظم وذواضعاف اقل۔سال ثانی: کسور اشاریہ واربع متناسبہ۔سال ثالث: متناسبہ وسود متی کاٹا وغیرہ۔ سال سادس: شرح چغمینی۔

سائنس: ثانویہ سال ثالث میں جدید سائنس اور سال رابع میں سائنس اور اسلام

انجینئرنگ وڈرائنگ: ثانویہ سال اول: نقشہ نویسیٔ اشجار، سال ثالث میں نقشہ نویسیٔ عمارات و مساحت۔سال خامس میں مساحت واقلیدس مقالہ اول۔

فلکیات/اسٹرانومی: عالیہ سال خامس: تصریح الافلاک۔سال سادس: مسامرہ شرح مسائرہ

ٹیکنالوجی/دستکاری: ثانویہ سال اول، ثانی، ثالث، رابع اور خامس۔عالیہ سال اول، ثانی، ثالث، رابع اور سادس۔اس زمانے کی مروج دستکاریاں جیسے چرخہ چلانا اور کپڑا بننا، حدادی (لوہے کا کام) نجاری (بڑھئی کا کام)، خیاطت (کپڑا سینا)، گھڑی سازی، جلد بندی، چمڑا رنگنا، بوٹ وغیرہ بنانا اور صیاغت (سونار کا کام) وغیرہ۔(اصول وقوانین کلیہ، رقم ۱۵)

لسانیات: زبانیں سکھانے کے معاملے میں مولانا کی پالیسی بہت ارفع ہے۔وہ کہتے ہیں: ''اس نصاب میں پانچ زبانوں کی تعلیم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔بنگلہ (صوبہ کی زبان) اردو، فارسی، انگریزی، عربی مگر اوّل الذکر (بنگلہ) کو بوجہ صوبہ کی زبان ہونے کے اور آخر الذکر (عربی) کو بوجہ مذہبی اور علمی زبان ہونے کے زیادہ تر اہمیت دی گئی ہے۔باقی ماندہ السنہ ثلاثہ (اردو، فارسی اور انگریزی) کو بقدر ضرورت لازم کیا گیا ہے۔البتہ اردو زبان چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور علمی زبان ہونے کا فخر بھی حاصل کرچکی ہے۔پھر انگریزی چونکہ حکومت کی زبان ہے اور بہت سے وہ دنیاوی کاروبار جن سے کوئی شخص تازیست مستغنی نہیں ہوسکتا، اس سے متعلق ہیں اس لیے اس کو فارسی زبان پر فوقیت دی گئی ہے''۔(اصول وقوانین کلیہ، رقم ۹)

تبلیغ کے لیے بین الاقوامی زبانیں سیکھنے کی حمایت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''سال ثالث سے طلباء درجہ کو زبان ہائے ذیل میں سے کوئی ایک زبان سیکھنی ہوگی: سنسکرت، برہمی، سیامی، تامل کھاسیا اوڑیا وغیرہ تاکہ بوقت ضرورت ان ملکوں میں تبلیغ کرسکیں''۔(اصول مخصوصہ نصاب درجہ عالیہ، رقم ۴)

ذریعۂ تعلیم کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ بچوں کو (پرائمری میں) حساب اور گنتی صوبہ کی (یعنی مقامی) زبان میں سکھائی جائے اور جغرافیہ اور نقشہ بھی اگر صوبہ کی زبان میں پایا جائے تو اس میں سکھایا جائے۔پریڈ بھی اردو یا صوبہ کی زبان میں ہونا چاہیے (اصول نصاب دوم ابتدائیہ، ۱۰، ۱۴، ۱۵)۔عربی علوم وفنون کے لیے البتہ وہ عربی ذریعہ تعلیم ہی کی سفارش کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اس نصاب میں فنون کو حتی الوسع ملکی زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے البتہ عربی علوم وفنون کو مختلف مصالح کی بناء پر عربی زبان میں ہی تعلیم دینا ضروری خیال کیا گیا ہے۔عربی زبان کے سوا اور دوسری زبانیں محض بحیثیت زبان تعلیم دی جائیں گی'' (اصول وقوانین کلیہ، رقم: ۱۷، ۱۸)۔

یہ زبانیں مولانا کس تدریج کے ساتھ اور کن کتب کے ذریعے سکھانا چاہتے ہیں، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

بنگلہ: ابتدائیہ سال اول: قاعدہ بنگلہ اور بنگلہ کی پہلی کتاب از مزمل حق ومکتب ریڈر بنگلہ حصہ اول۔سال ثانی: بنگلہ کی تیسری کتاب ومکتب ریڈر ۲۔سال ثالث: بنگلہ کی چوتھی کتاب (سکتا پار) مصنفہ افضل النساء خاتون مع املاء وکتابت۔ثانویہ سال اول: بنگلہ کی پانچویں کتاب (سول سہاتھا) مصنفہ قاضی عبدالحق مع تحریر۔سال ثانی: سہاتھا کسوم مع تحریر از سعادت علی خان ۔سال ثالث: ادبیات بنگلہ از قاضی امدادالحق ۔سال رابع: ادبیات بنگلہ۔عالیہ سال اول: مشق تقریر۔

فارسی: ثانویہ سال اول: فارسی کی پہلی کتاب مع دبستان دانش ۔سال ثانی: فارسی کی دوسری وتیسری کتاب مع تحریر ومصادر۔سال ثالث: گلستان سعدی یا چوتھی کتاب فارسی ۔عالیہ سال اول: مشق

اردو: ابتدائیہ سال ثانی: اردو کی پہلی کتاب مع کتابت۔سال ثالث: اردو کی دوسری وتیسری کتاب مع املاء وکتابت۔ثانویہ سال اول: قواعد اردو ۱، ۲ از اسماعیل میرٹھی۔سال ثانی: سفینۂ اردو وآئین اردو۔ سال ثالث: آئین اردو ومضامین الکلام۔سال رابع: آئین اردو وکلام جوہر واقبال، مشق تقریر۔سال خامس: دیوان غالب

انگریزی: ثانویہ سال اول: کنگ پرائمر وفرسٹ ریڈر۔سال ثانی: سیکنڈ ریڈر مع کتابت۔سال ثالث: انگریزی ریڈر ۳۔سال رابع: انگریزی ریڈر ۴ مع املاء وکتابت۔عالیہ سال اول: مشق تقریر

عربی (زبان، ادب اور بلاغہ): ابتدائیہ سال اول: قاعدہ عربی۔ثانویہ سال ثالث: رسالہ علم الصرف ۱، ۲ از مولوی مشتاق احمد وصفوۃ المصادر۔سال رابع: درایۃ الادب ومدارج القرأۃ، رسالہ علم الصرف و صرف میر، نحو میر وسلم الدروس العربیہ للغلایینی۔عالیہ سال اول: الدروس العربیہ ۳، ۴، الفیہ ابن مالک، نفحۃ الیمن، ازہار العرب، مجموع الادب فی فنون العرب۔سال دوم: الفیہ ابن مالک وابن عقیل، مقامات حریری۔سال ثالث: دیوان متنبی، شرح ثمر قندیہ فی الاستعارات یا شرح تحفۃ الاخوان للدردیر ونفح الطیب ومعانی فن اول۔سال رابع: مختصر المعانی، دیوان حماسہ، المحاسن والاضداد للجاحظ، مشق تقریر۔ سال خامس: سبعہ معلقہ، دیوان معری۔سال سادس: ادب الکتاب للصولی۔سال سابع: ادب الکتاب و سال ثامن: مشق تحریر ☆

☆ تعجیل میں ممکن ہے بعض کتب کا محل صحیح نہ ہو یا متعین کرنا رہ گیا ہو۔ نظرِ ثانی میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا، ان شاء اللہ۔

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

دعاء مانگنا سیکھیے

س: دعا کسے کہتے ہیں؟

ج: بندے کا پورے اعتماد، کامل تذلل، پوری رغبت، خشیت اور بے بسی کے ساتھ اپنے رب کو پکارنا۔

س: حدیث شریف میں دعا کو مخ العبادۃ فرمایا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

ج: ابھی دعا کی جو تعریف عرض کی گئی ہے اسے دیکھ لیں، یہی عبادت کا جوہر ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح سمجھیں کہ عبادت نام ہے معبود کے استحضار کا۔ دعا یعنی اللہ کو پکارنے کا عمل فطری طور پر اس استحضار کو دیگر تمام عبادات کے مقابلے میں زیادہ شدت کے ساتھ قائم کر دیتا ہے۔ دعا کرنے والا طبعاً اس کیفیت اور شعور سے معمور ہوتا ہے کہ دوسرے سرے پر اللہ ہے جو میری پکار سن رہا ہے۔ ویسے یہ بات ذہن میں رہے کہ حدیث میں دعا سے مراد محض مانگنا نہیں ہے بلکہ اللہ کو پکارنا ہے جو ذکر کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے کی گئی ہے کہ اگر دعا کو محض مانگنے تک محدود کر دیا جائے تو اس میں اپنی احتیاج کا زور غالب ہوتا ہے لہٰذا ایسا اشتغال مخ العبادہ نہیں کہلا سکتا۔ یہ بندگی کا خلاصہ تو ہوسکتا ہے کہ بندگی احتیاج ہی کا دوسرا نام ہے لیکن عبادت کا نہیں۔ عبادت کا جوہر اللہ کی یاد کا مکمل غلبہ ہے۔ تو اب ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دعا اللہ کو پکارنے کا عمل ہے جس میں مانگنا بھی شامل ہے۔

اس حدیث مبارکہ کی ایک شرح یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بندے کے لئے اللہ کا حضور اس کی ربوبیت، رحمت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ تمام اوصاف اللہ کو مخاطب کرنے کا جو اسلوب ہماری فطرت میں تشکیل دیتے ہیں وہ عبادت اور استعانت سے مل کر بنا ہے یعنی اللہ کی وہ صفات جو بندے کے اندر اس کی یاد اور تعلق کا سبب بنتی ہیں، عبادت اور استعانت سے مناسبت رکھتی ہیں۔ دعا عبادت اور استعانت ہی سے مرکب ہے یعنی کل بندگی اور تمام اوضاعِ بندگی کا جوہر ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے دعا کا یہ مطلب ارشاد فرما کر ہمیں یہ بتایا ہے کہ دعا اصولِ عبادت، شانِ معبودیت اور حقیقتِ بندگی کی معرفت ہے۔ دعا میں یہ معرفت حسی درجے پر میسر آجاتی ہے جس سے بڑھ کر کمال کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

زیادہ عام فہم انداز میں سمجھنا ہو تو مندرجہ ذیل نکات توجہ سے دیکھ لیں:

۱۔ عبادت کا جوہر اللہ کی معبودیت اور اپنی بندگی کو حاضر رکھنا ہے

۲۔ معبودیت کا دھیان کرتے ہوئے یہ اوصاف خودبخود یاد آجاتے ہیں:

-الوہیت -ربوبیت -رحمت -یوم آخرت کی بادشاہی

۳۔ بندگی کا پورا دھیان یہ ہے کہ اپنی دو چیزیں بالکل زندہ حالت میں محسوس ہوں: عبادت یعنی اللہ کے آگے جھکنا اور استعانت یعنی اللہ کو پکارنا۔ دعا میں عبادت اور استعانت دونوں یکجان ہوجاتی ہیں۔

ان نکات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عبادت کا سب سے کامل اور انتہائی حال یعنی بندگی اور معبودیت کا بیک وقت استحضار، دعا میں طبعی طور پر حاصل ہوجاتا ہے۔ اسی وصف کی بناء پر اسے عبادت کا مغز فرمایا گیا ہے۔

ذوقی انداز سے کہیں تو دعا مکمل بندگی کی علامت ہے یا بندگی کی حقیقت کا کامل اظہار ہے۔ دعا کے وقت یہ بات قلب و ذہن میں رہنی چاہیے کہ میں پورا کا پورا کلمات دعا میں سما کر اپنے رب کے حضور میں پیش ہو رہا ہوں۔ پھر چاہے آدمی چھوٹی چیز مانگے یا بڑی، اعلیٰ درجے کی ثنا کرے یا اپنی حیثیت کے مطابق معمول کی حمد میں مشغول رہے، اس کی تاثیر نفس میں حقیقت بندگی کا ایک ذائقہ پیدا کردے گی جو احتیاط اور استقامت کے ساتھ برقرار رکھا جائے تو ذکر دوام اور احسان بن جاتا ہے۔ جو آدمی اس کے آداب کے ساتھ اسے نبھانے میں کامیاب ہوجاتا ہے وہ مقربین کے طبقے میں جگہ پاتا ہے کیونکہ دعا سے زیادہ حامل قرب کوئی اور چیز نہیں ہے جیسا کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ... (البقرہ ۲:۱۸۶)

’’(اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو کہہ دو کہ میں تو تمہارے پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں‘‘۔

س: یوں محسوس ہوتا ہے کہ دیگر عبادات کے مقابلے میں دعا میں بندے کی شمولیت زیادہ ہوتی ہے۔ شمولیت سے ہماری مراد یہ ہے کہ دعا کا عمل انسان کے بڑے حصے کا احاطہ کرلیتا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ اور اگر یہ بات درست ہے تو کیا اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بندگی کی مخصوص نفسیات کی تعمیر میں دعا کا ایک بہت بڑا اور مرکزی کردار ہے؟

ج: یہ دونوں باتیں بالکل ٹھیک ہیں۔ دعا نفس کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہے اور بدلنے کی قوت اور تاثیر رکھتی ہے لہٰذا یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ بندے کو جس نفسیاتی معیار اور صحت کا حامل ہونا چاہیے، اس کا حصول دعا میں رسوخ پیدا کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیں۔ دعا میں بندے کو اپنی حقیقت اور ضرورت کا خودبخود جتنا احساس رہتا ہے وہ عبادت کی دوسری اقسام میں مشکل ہے۔ دعا

ایک طرح سے بندگی کی اس روح کا اظہار ہے جو ذکر اور استعانت سے عبادت ہے۔ اللہ کی یاد اور اپنی محتاجی کا سچا احساس اگر ایک ہو جائیں تو اس کے نتیجے میں جو چیزیں بھی حاصل ہوتی ہیں، ان میں ایک وصف ضرور پایا جائے گا اور وہ ہے حسِ تعلق کی تسکین۔ اس نکتے کی طرف ہم بعد میں آئیں گے کہ یہ حسِ تعلق کیا ہے اور اس کی تسکین سے کیا مراد ہے؟ سردست اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ احتیاج انسانی نفس کے لیے بندگی کا سب سے ٹھوس اور محکم تجربہ ہے جو اثر اندازی کے معاملے میں باقی چیزوں سے بہت آگے ہے یعنی بندگی پورے انسانی پن کے ساتھ جس شعور اور کیفیت میں سب سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے وہ یہی احتیاج ہے۔ اس کا شعور کبھی ماند نہیں پڑتا اور اس کا احساس شدید اور گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ دائمی بھی ہے۔ اصول کی بات ہے کہ جو چیز شعور اور احساس دونوں میں شدت، گہرائی اور دوام پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ ذہن سے لے کر طبیعت تک کے تمام مراحل میں حاضر اور برقرار رہتی ہے۔

یہاں ذرا سا رک کر یہ دیکھ لینا بہتر ہوگا کہ نفس کے مقاصد، چاہے اچھے ہوں یا برے، اس وقت تک ہاتھ نہیں آتے اور نفس پر ان کے اثرات پوری طرح مرتب نہیں ہوتے جب تک نفس اپنی تمام قوتوں اور مدارج کے ساتھ ان کی طرف یکسو نہ ہو جائے اور اس یکسوئی کے حصول میں کامیابی ممکن نہیں ہے جب تک کہ نفس کے اندر اپنے مقصود کا استحضار اور اپنی ضرورت کا شعور و احساس پوری طرح سے کار فرما نہ ہو۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ نفس کی سب سے بڑی قوت یکسوئی ہے۔ یکسوئی کے لئے چند چیزیں لازماً درکار ہیں:

۱۔ مقصود کا ہونا

۲۔ مقصود کے حصول کی طلب اور اس حصول کے ذرائع کا علم

۳۔ مقصود کا استحضار ۴۔ مقصود پر انحصار

۵۔ اپنے نقائص، مجبوریوں اور ضرورتوں کا ادراک جن کی تکمیل مقصود کی طرف سے ہوتی ہے۔

اس اصول اور اس کے مذکورہ بالا اجزاء کو شرعی پس منظر میں اس طرح بیان کیا جائے گا کہ نفس کو بندگی کے سانچے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ عبادت اور اسعانت۔ عبادت میں شعورِ بندگی کارفرما ہوتا ہے جس سے نفس کا ہدف متعین ہو جاتا ہے اور استعانت احساس بندگی سے عبارت ہے جس میں نفس کی فعلیت کا مرکز درست رہتا ہے۔ احساسِ بندگی میں وفور پیدا ہوئے بغیر نفس کی پوری ساخت تبدیلی کے عمل سے نہیں گزرتی یعنی محض شعور نفس کو اول سے آخر تک بدلنے کے لئے کافی نہیں ہے تاوقتیکہ احساس کی کمک بھی حاصل نہ ہو جائے کیونکہ نفس اپنی ماہیت میں ذہن کے مقابلے میں حس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کا بنیادی وظیفہ حق و ناحق یا صحیح و غلط کی تمیز نہیں ہے بلکہ پسندیدہ و ناپسندیدہ کی

تفریق ہے۔ رغبت وکراہت کی سطح تک اترے بغیر کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی نفس کو اندر سے منقلب نہیں کر سکتی مثلاً حق کا شعور اور صحیح بات کا علم نفس کی تبدیلی کے حدود متعین کرتے ہیں لیکن اگر نفس ان کی طرف راغب نہ ہو سکے تو تبدیلی اور تزکیے کا عمل مطلوبہ تکمیل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اس تناظر میں دیکھیں تو واضح طور پر نظر آ جائے گا کہ نفس میں عبادت کی تاثیر اس احساسِ محتاجی پر موقوف ہے جس کو شعور کی بھی تائید حاصل ہو۔ یہی استعانت کا منبع ہے جو دراصل نفس کا حقیقی اسلوبِ عبادت ہے۔

بات یہی ہے مگر دوسرے رخ سے کہی جا رہی ہے کہ نفس تسکین کا جویا ہے، اچھے معنی میں بھی اور برے معنی میں بھی --- بالکل اسی طرح جیسے آنکھ دیکھنے پر مجبور ہے یا کان سننے پر معمور ہے۔ یہ طلب تسکین، ظاہر ہے کہ احتیاج پر مبنی ہے یعنی نفس سراپا احتیاج ہے اور چیزوں کے ساتھ اس کا جو بھی تعلق ہے وہ رفع احتیاج کے پہلو سے ہے --- رفعِ احتیاج یعنی تسکین۔ اب دیکھیے کہ دعا نفس کی خلقتِ اصلی سے کس قدر مناسبت رکھتی ہے۔ یہ بندگی کو احتیاج بنا دیتی ہے اور احتیاج کو بندگی، یعنی نفس کو کسی اہانت یا احساسِ شکست میں مبتلا کیے بغیر اس کے بنیادی داعیے کو محض مقاصد کا درست تعین کر کے اس کی تبدیلی کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔ دعا میں تسکین دہی کا عنصر یوں بھی بحد کمال ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص تاثیر یہ بھی ہے کہ یہ احتیاج کو اس کی تمام تر شدت قائم رکھتے ہوئے بالکل بدل دیتی ہے۔ نفس کے تزکیہ وتبدیلی کی سب سے موثر اور فطری صورت یہی تو ہے کہ اس کا اصل سرمایہ یعنی احساس ضرورت برقرار رہے اور ضرورت بدل جائے۔ طلب، تمنا، رغبت یہ چیزیں وہی رہتی ہیں مگر ہدف کی تبدیلی سے زمین وآسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔

نفس کا دوسرا خلقی تقاضا یہ ہے کہ یہ خود کو اوجھل نہیں کرنا چاہتا۔ اسے خود فراموشی کسی بھی قیمت پر قبول نہیں۔ دعا میں اس تقاضے کا لحاظ بھی پایا جاتا ہے اور اس کی درست سمت میں کارفرمائی کا سامان بھی۔ کیا یہ بات ہم سب کے تجربے میں نہیں ہے کہ دیگر عبادات میں اللہ کا دھیان غالب رہنا چاہیے اور اپنا شعور مغلوب جبکہ دعا کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دعا میں اپنا شعور بھی پوری قوت کے ساتھ موجود رہتا ہے بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود شعوری کی جو سطح دعا میں میسر آتی ہے وہ زندگی کے کسی اور مرحلے پر حاصل نہیں ہوتی۔ بندہ خود پر جتنا دعا میں کھلتا ہے اتنا کسی اور موقع پر نہیں کھلتا۔ اس جہت سے بھی دعا نفس کو بندگی کے رنگ میں رنگنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔

نفس کی تیسری بڑی ضرورت اپنا تحفظ ہے۔ یہ تحفظ کے احساس میں رہنا چاہتا ہے جب اپنے چاروں طرف موجود دنیا میں اپنی حفاظت کا یقینی بدوبست نہیں دیکھتا تو اپنے طور پر اس کا سامان کرنے لگتا ہے، کبھی سرکش بنا کر، کبھی جویائے لذات بن کر اور کبھی ہر طرف سے غافل ہو کر — دوسری طرف تحفظ کی فراہمی دعا کے لوازم میں سے ہے اور چونکہ دعا خود ایک مرکز یقین ہے لہٰذا تحفظ کی ہر صورت شعور اور

احساس دونوں دائروں میں ایک تعین حاصل کر لیتی ہے۔ (جاری ہے)

اسلام اور سائنس

محمد رشید☆

سائنس مخالفین کی فکری بنیادیں

پاکستان میں سائنس مخالف مکتبہ فکر کے ایک نمائندہ اور جوہری مضمون کے تنقیدی جائزہ اور تردید پر مبنی راقم کا مضمون ''سائنس کی مخالفت کے جواب میں'' جون ۲۰۱۲ ئمیں شائع ہوا۔البرہان اکتوبر کے شمارے میں اس مضمون کا مرکزی خیال ان الفاظ میں شائع ہوا:

''مغربی سائنس وٹیکنالوجی کی مخالفت اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دینا مسلمانوں کو سائنس وٹیکنالوجی سے محروم رکھنے کی ایک 'سازش' ہے۔'' (البرہان، اکتوبر ۲۰۱۲ء)

اپنے موقف کی ترجمانی میں راقم کو''مغربی سائنس وٹیکنالوجی''اور''سازش'' کے الفاظ پڑھ کر اچھی خاصی خفت محسوس ہوئی۔راقم کو محسوس ہوا کہ شاید اس نے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ابلاغ وتفہیم کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب میں کوتاہی برتی ہے۔اس تناظر میں تنقیدی نکتہ نگاہ سے اپنا مضمون دوبارہ پڑھا۔دوبارہ مطالعہ کے بعد اطمینان ہوا کہ اپنے مدعا کی تفہیم وابلاغ میں ہم نے مذکورہ بالا دونوں الفاظ استعمال نہیں کیے۔تاہم اس کرب سے ہم ضرور دوچار ہوئے کہ مقدور بھر کوشش کے باوجود ہم اپنے مدعا کے ابلاغ میں کامیاب کیوں نہیں ہو پائے۔ذیل کی سطور راقم کے اسی کرب کا شاید جواب ہیں۔

گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے یہاں اپنے مضمون کے مرکزی نکتہ کی طرف متوجہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔راقم نے تحریر کیا تھا کہ:

۱۔ ''مغرب کے دجالی ذہن نے ''سائنس'' پر خدا بیزاری اور مذہب دشمنی کا پردہ ڈال کر درحقیقت انسانیت کو سائنس کے حقیقی فوائد سے محروم کرنے اور اپنے ابلیسی مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔'' (سائنس کی مخالفت کے جواب میں،ص ۳۹،البرہان،جون ۲۰۱۲ء)

۲۔ سائنس کے مختلف میدان ہائے کار مثلاً حساب،لوہے کی صنعت،زیور وسکہ سازی،زراعت وآبپاشی،وٹرنری،طب،ذرائع رسل ورسائل،مواصلات،جیولوجی اور دفاع کی سائنسز کا ذکر کرتے

☆ ملتان abu_munzir1999@yahoo.com

ہوئے راقم نے تحریر کیا تھا کہ:

''درج بالا تمام تقاضے اور ضروریات سائنس اور سائنسی ترقی کو وجود میں لانے کا بنیادی سبب ہیں۔ اگر انسانی جبلت کے یہ تمام تقاضے اور ضرورتیں خدا اور وحی کے انکار کے ہم معنی ہیں تو پھر یقیناً ''سائنس'' کفر ہے ....یہی چیز درحقیقت سائنس کی اصل اور اس کا جوہر ہے۔'' (سائنس کی مخالفت کے جواب میں، ص ۴۰، البرہان، جون ۲۰۱۲ء)

مضمون کا مرکزی خیال: ہم اپنے مضمون کا مرکزی خیال درج ذیل الفاظ میں بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

> ''مغرب کے دجالی ذہن نے ''سائنس'' پر خدا بیزاری اور مذہب دشمنی کا پردہ ڈال کر درحقیقت انسانیت کو سائنس کے حقیقی فوائد سے محروم کرنے اور اپنے ابلیسی مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سائنس کو خدا اور معبود کے مقام پر لا بٹھانا ایک قسم کی انتہا پسندی تھی تو اس کو اسلام اور انسانیت کا دشمن ثابت کرنا دوسری قسم کی انتہا پسندی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں میں سے جو اہل علم اسلام اور سائنس کو ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اسلام اور انسانیت کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ لاشعوری طور پر مغرب کے ابلیسی پروگرام کو پھیلانے اور اس کی تائید وتقویت کا باعث بن رہے ہیں۔''

سائنس مخالف سوچ کی فکری بنیادیں: ان تمہیدی سطور کے ساتھ ہم عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اسلام اور سائنس میں محاربت ومخالفت کا دعویٰ کرنے والے حضرات کی تمام تر کاوشوں کا مقصود مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ اور گروہ پیدا کرنا ہے جو منطقی وعقلی دلائل سے مسلح ہوکر اور مغربی فلاسفہ کی نام نہاد سائنٹزم کو بنیاد بنا کر اسلام کو سائنس وٹیکنالوجی کا بدترین مخالف ثابت کرے۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے یہ حضرات سائنس وٹیکنالوجی کے منفی استعمالات اور مغربی ملحدانہ ومادہ پرستانہ فلاسفہ کی فکر کو Scientism کے عنوان سے سائنس کے خلاف سب سے مضبوط ترین دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مکتب فکر کی دوسری کوئی ٹھوس فکری بنیاد نظر نہیں آتی۔

چنانچہ اپنے اس طریق واردات میں یہ حضرات جدید دور کے ہر اس محترم داعی، مفکر، عالم دین اور سلیم الفطرت ومتوازن الفکر قابل ذکر شخصیت کی تحقیر وتردید اور تمسخر اڑانا ضروری خیال کرتے ہیں، جن کے افکار وتحریروں سے ان کے اس انتہا پسندانہ اور غالی فکر کے عدم توازن اور عدم سلامتی کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے یہ مکتب فکر سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ سے لے کر سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور تک ......علامہ محمد اقبال سے لے کر ڈاکٹر رفیع الدین تک کو اور ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ سے لے کر ہر اس قابل ذکر عالم دین پر طعن اور تردید کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں جن کی تحریریں ان کے اس ''غالی فکر'' کی حمایت کی بجائے تردید کا باعث بن سکتی ہیں۔

یہ مکتب فکر اپنی فکری بنیادوں کی تعمیر کے لیے مغربی فلاسفہ اور مغربی مفکرین کی تحریروں، کتابوں اور مقالوں کے اکثر وبیشتر محض ناموں کو سند اور برہان قاطع کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کتابیں اور مقالہ جات نہیں پڑھے ہم نے ان کے کسی سوال اور اعتراض کا کوئی جواب نہیں دینا۔ گویا دوسرے لفظوں میں اس طرز عمل سے یہ حضرات اپنے نظریہ کی فکری بنیادوں اور اصل ماخذ وسرچشمہ کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ قابل تعجب مقام یہ ہے کہ ان حضرات کی فکر اور تحریروں کے نتیجے میں ایک قاری مخاطب تو ان حضرات سے ہونا چاہتا ہے لیکن یہ اپنے مخاطب کو پکڑ کر مغربی فلاسفہ کی خدمت میں لے جاتے ہیں اور قاری سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بھی سائنس کی وہی تعریف درست مان لے جس کا اعلان واظہار مغرب کے یہ حمقاء اپنی فاسد اور ایمان سے عاری سوچ کی بنیاد پر اور اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے کر رہے ہیں۔ ہم بصد احترام عرض کریں گے کہ اگر ہم نے مغربی فلاسفہ سے یا ان کے کسی پیروکار سے ہمکلام ہونا ہوتا تو ہم یقیناً ان کی کتب کا مطالعہ کرتے۔ لیکن ہم تو جناب خالد جامعی اور زاہد صدیق مغل صاحب سے مخاطب ہیں اور ان سے مکالمہ کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم صرف انہی کے افکار اور تحریروں کا مطالعہ کر لیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ زیر بحث مکتب فکر سے مکالمہ کے لیے سائنس کے ان مغربی قبضہ گروپ فلاسفہ کا حوالہ دے کر ان کو پڑھنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جنہوں نے ہر دور میں سائنس پر جھوٹ، تلبیس اور دجالیت کی ملمع سازی کرنے کی کوشش کی۔ وہ مغربی فلاسفہ جن کے بارے میں اور یا مقبول جان لکھتے ہیں کہ ''سائنس میں کوپرنیکس، نیوٹن اور ڈالٹن کے نظریات کو آئن سٹائن نے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے اور کہا کہ تم سائنس کے نام پر تین سو سال تک جھوٹ پڑھاتے رہے ہو''۔ کیا ان فلاسفہ کے جھوٹ کو پڑھنا ضروری ہے جو کئی دہائیوں تک ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو ثابت شدہ سائنسی حقیقت اور مغرب کے متفق علیہ عقیدہ کے طور پر پڑھاتے رہے

ہیں۔ یہاں تک کہ اکیسویں صدی کے اواخر میں ارتقاء کی یہ تھیوری محض فراڈ اور دھوکہ ثابت ہوئی۔ اور خود سائنس دانوں ہی نے اس خودساختہ مفروضہ کی دجالیت کا پردہ چاک کیا ہے۔

خالد جامعی صاحب کی چند خصوصیات: زیر بحث مکتب فکر کے موجودہ فکری قائد خالد جامعی صاحب ایک عالم و فاضل شخصیت ہیں اور ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے لیکن موضوع زیر بحث کے حوالے سے ان کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو نوٹ کرنے کے قابل ہیں:

(۱) اپنی فکر کی ترویج کے لیے جو رسالہ (ساحل) وہ شائع کرتے رہے ہیں اس کی تحریر کا (Font) سائز انہوں نے اتنا چھوٹا رکھا ہے کہ ایک نارمل انسان کے لیے اس کا پڑھنا ہی بے حد تکلیف اور زحمت کا باعث بنتا ہے۔ غالباً سائنس کی ضد میں وہ انسان کو اپنے تئیں جو ''راست فکر'' دینا چاہتے ہیں اس کے ابلاغ میں بھی وہ اپنے مخاطب کو مصنوعی طور پر تکلیف اور زحمت کے مراحل سے گزارنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۲) اپنے مخاطبین اور قارئین کو تکلیف پہنچانے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جناب جامعی صاحب بلا تکان، بلا توقف اور بلا تخصیص لکھتے چلے جاتے ہیں۔ قاری کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کون سے پیرے یا کون سے صفحے کے کس مقام پر وہ اپنے کون سے دعویٰ کی دلیل پیش کر رہے ہیں۔ قاری کو ان کی تحریروں میں دعویٰ (مفروضہ) اور پھر اس کے بعد آنکھوں اور دماغ کو تھکا دینے والے اور نہ ختم ہونے والے متعلق و غیر متعلق مواد کا بے ربط و بے ترتیب ہجوم ملتا ہے۔ مواد کے اس بے ترتیب ہجوم میں وہ مغربی فلاسفہ وحکماء (شیخ احمد سرہندیؒ کے الفاظ میں حمقاء) کی کتابوں اور مقالہ جات کے ناموں کا رعب کچھ اس طرح سے قاری پر ڈالتے ہیں کہ ایک سادہ دل اور عام فہم قاری یا تو بغیر کسی دلیل اور بحث کے ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے اور یا پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

(۳) جناب جامعی صاحب کے لیے معقول طریقہ تو یہ تھا کہ جن جن فلاسفہ کی تحریروں سے وہ اپنی فکری بنیادیں استوار کرتے ہیں، ان کی تحریروں میں بیان کیے جانے والے دلائل کو وہ بحث کے لیے پیش کرتے۔ نتیجتاً اگر تو یہ دلائل اپنے دعویٰ کو ثابت کر دیتے تو ایک قاری کے لیے علی وجہ البصیرت ان کا ہمنوا بننا بہت آسان ہو جاتا۔ بصورت دیگر دعویٰ اور دلیل میں ہم آہنگی ثابت نہ ہونے کی صورت میں نہ صرف مغربی فلاسفہ بلکہ جامعی صاحب کے موقف کا رد کرنا ایک قاری کے لیے بے حد آسان ہو جاتا۔

تاہم موجودہ صورت میں ہم نہایت دیانتداری سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ''اسلام اور سائنس کی باہمی ضد، مخالفت، عناد اور عداوت'' پر مبنی فلسفہ اور فکر توازن اور سلامتی سے عاری ہے۔ یہ ایک غالی فکر

ہے جو بظاہر اسلام سے محبت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے لیکن اپنے نتیجہ کے طور پر یہ فکر اسلام کے بدترین مخالفوں، عالمی استعمار اور ابلیسی مقاصد کو زبردست معاونت، سپورٹ اور خدمات فراہم کر رہی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس فکر کے آغاز میں کوئی مثبت جذبہ اور اچھی سوچ کارفرما ہو لیکن جب یہ فکر اعتدال اور توازن کی حدود عبور کر جاتی ہے تو اپنی ہی قائم کی ہوئی حدود اور معیار کو پامال کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے، بالکل ان لوگوں کی طرح جن کے بارے میں قرآن حکیم نے یہ فرمایا ہے:

{وَرَهَبَانية ابتدعوها ما كتبنٰها عليهم الا ابتغاء رضوان اللّٰه فما رعوها حق رعايتها......} (الحديد ۵۷:۲۷)

''اور رہبانیت (لذت سے کنارہ کشی) تو انہوں نے خود ایک نئی بات نکال لی تھی ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر انہوں نے اپنے خیال میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (آپ ہی ایسا کر لیا تھا) پھر جیسا اس کو نباہنا چاہیے تھا نباہ بھی نہ سکے۔''

عقل، علم اور مال و دولت کی جدید شکل......سائنس: راقم کی نہایت طالب علمانہ رائے میں اسلام اور قرآن کے وہ تمام احکامات ''سائنس'' پر بھی لاگو ہوتے ہیں جو ''عقل، علم اور مال و دولت'' کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے سائنس دراصل ''عقل، علم اور مال و دولت'' ہی کی ایک جدید ترین شکل ہے۔ دوسرے لفظوں میں صدیوں پہلے انسانی معاشروں میں جو اہمیت اور جو مقام و مرتبہ ''عقل، علم اور مال و دولت'' کو حاصل ہوا کرتا تھا، جدید دور میں وہی مقام و مرتبہ ''سائنس اور ٹیکنالوجی'' کو حاصل ہوگیا ہے۔ اس تناظر میں ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ''عقل، علم اور مال و دولت'' اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت، عطا اور آزمائش ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ اس لیے دی ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور خزانے کو انسانیت کی فلاح، اصلاح اور بہتری کے لیے استعمال کرے۔ لیکن صدیوں پر محیط تجربات ثابت کرتے ہیں کہ انسان ہر ہر دور میں ''عقل، علم اور مال و دولت'' کے بل بوتے پر بجائے خدا کے آگے سربسجود ہونے کے خود ہی خدا بن بیٹھا ہے اور بجائے انسانیت کا سچا ہمدرد و غمخوار بننے کے انسانیت کو دکھوں اور محرومیوں کے جہنم کی آخری حدوں کی طرف دھکیلنے میں مگن رہا ہے۔ اس نے اللہ کی دی ہوئی اس بیش بہا طاقت اور خزانے کو اپنی شیطانی سوچ کو مسلط کرنے، اپنی انانیت و ابلیسیت کو منوانے اور انسانیت پر ظلم و استیصال، فساد، خون خرابے اور بستیوں و کھیتیوں کو اجاڑنے کے لیے بے دریغ استعمال کیا لیکن ''عقل، علم اور مال و دولت'' کے خلاف ان واضح شواہد و تجربات کے باوجود اسلام اور قرآن نے اسے خدا، مذہب، وحی اور انسانی زندگی کی ضد قرار دے

کرانسان کے لیے مضر، مہلک اور ممنوع ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس انسان کی حیرت واستعجاب کی اس وقت کوئی حد نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ (اسلام، قرآن اور سیرت رحمت اللعالمین ﷺ کے ذریعے) انسانی معاشرے کی تشکیل وفلاح کے لیے ''عقل، علم اور مال ودولت'' کے ناگزیر استعمال کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اس بیش بہا نعمت کے درست استعمال، اسے محرومین و مستحقین میں بانٹنے اور اس کے ذریعے معاشرے کی فلاح وبہبود کے کام کو ایک بہت بڑی نیکی، عبادت اور فریضہ قرار دیتا ہے۔

مشیت اور شریعت کا فرق: اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو ہمیشہ ''عقل، علم اور مال ودولت'' (مادی وسائنسی ٹیکنالوجی کی طاقت) کے پہلو سے اپنے عہد کی قوموں کے مقابلہ میں وسائل وٹیکنالوجی میں غیر معمولی حد تک کمزور اور کمتر ہونے کے باوجود اپنے دین کو غالب کرتا رہا ہے۔ شاید آخری دور میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ دین اسلام کو اپنی اسی سنت کے مطابق پوری دنیا پر غالب کر کے دکھائیں گے۔ تاہم واضح رہے کہ یہ حکمت ومشیت ربانی اور ارادۂ الٰہی کے دائرہ کا معاملہ ہے نہ کہ شریعت کا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سپریم ہے وہ مادہ وسائنس کا محتاج نہیں ہے، وہ جو چاہے کرسکتا ہے، وہ ہر چیز سے وراء الوراء ہے۔ صرف اسے ہی اپنا کبر، بڑائی اور طاقت منوانے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا وہ نہایت کم مادی وسائل کے حامل اپنے سچے ماننے والوں سے کافروں کو مادی پہلو سے بے حد زیادہ طاقتور ہونے کے باوجود عبرتناک شکست سے دوچار کرتا رہا ہے جب کہ اس کے برعکس انسان تو ہے ہی سراپا احتیاج، وسائل وذرائع اور حواس وماحول میں گھرا ہوا۔ لہٰذا شریعت نے انسان کی ان ناگزیر مجبوریوں اور ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر معتدل ترین، متوازن ترین اور بہترین وحسین ترین عملی ہدایات شریعت کی شکل میں دی ہیں۔ انسان کو شریعت کا پابند کیا گیا ہے اور انسان کو یہ حق بالکل نہیں دیا گیا کہ وہ شریعت کی حدود سے نکل کر سنت اللہ اور اختیار خداوندی کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرے کیونکہ ایک کمزور وناتواں مخلوق کے لیے یہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہمسری کرنے کی کوشش ہے۔ انسان کو صرف اس کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ دستیاب ''عقل، علم اور دولت'' (آج کی اصطلاح میں سائنس وٹیکنالوجی) کی بہترین منصوبہ بندی کرتے ہوئے اور اس کا بہترین استعمال کرتے ہوئے اللہ کی خوشنودی (بندگی رب اور صلاح وفلاح انسانیت کے مقصد) کو حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش کرے جب کہ نتیجہ کے لیے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اس کے حضور اپنے عجز اور بے طاقتی کا والہانہ اظہار کرے۔ یعنی مادی طاقت اور عقلی منصوبہ بندی کے مقدور بھر استعمال کے باوجود نتائج کے حصول کے لیے ان سب مادی اسباب سے ذہناً اور قلباً ہٹ کٹ کر خالصتاً اللہ تعالیٰ کی غیبی طاقت کے حصول کے

لیے والہانہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے اور رجوع و انابت کی شکل میں اس کا دامن مضبوطی سے تھامے رہے۔۔اس تناظر میں سائنس وٹیکنالوجی کو کفر ثابت کرنا اور اسے اسلامی زندگی سے نکال باہر پھینکنے کی دعوت دینا ایک نہایت اجنبی اور اسلام کی تائید سے محروم دعوت محسوس ہوتی ہے۔قرآنی دلائل اور روشنی سے محروم یہ ایک سلبی، غالی اور بے برکت فکر ہے، جو اسلام کا نقصان کرنے،انسانیت کو بھٹکانے اور ابلیس کی مقصد برآری میں تو کام آسکتی ہے،اس سے کوئی خیر کا کام نہیں لیا جاسکتا۔

رہبانیت کی طرف سفر: زیر بحث فکر اپنے نتیجے کے اعتبار سے اسلام کو زندگی کے عملی میدانوں سے نکال کر اسے محض مسجد و خانقاہ کے کونے کھدروں میں چھپنے پر مجبور کر دیتی ہے اور پھر مسجد و خانقاہ میں بھی یہ اپنے بیان کیے ہوئے معیارات واصولوں کی پاسداری نہیں کرسکتی۔کیونکہ مسجد وخانقاہ میں بھی یہ ''عقل،علم اور مال ودولت'' کی جدید شکل یعنی سائنس وٹیکنالوجی کی مصنوعات کا بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ہمیں عرض کرنے دیجیے کہ زیر بحث مکتب فکر درحقیقت رہبانیت ہی کی ایک جدید شکل ہے۔وہی رہبانیت جس نے مشرق ومغرب میں کلیسائی جبر کو خوب کھل کر کھیلنے کے مواقع دیے۔زیر بحث فکر اپنے نتیجے کے اعتبار سے مذہب/ اسلام کو زندگی کے عملی میدانوں سے نکال باہر کرتی ہے اور اس طرح مذہب کی ناکامی کا چوپٹ دروازہ کھول دیتی ہے۔

سائنس کے ساتھ متوازن رویہ: اس مقام پر ہم یہ وضاحت کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سائنس کے بہیمانہ،اندھادھند اور غیر متوازن استعمال پر تنقید کرے اور سائنس وٹیکنالوجی کے ساتھ ہمارے بالافراط تمتع واستغراق کے نقصانات سے ہمیں آگاہ کرے کہ اس طرز عمل نے ہمیں درجنوں مسائل ومشکلات سے دوچار کر دیا ہے اور ہمیں ایک روحانی تعذیب میں مبتلا کر دیا ہے چنانچہ اس مشکل اور غیر متوازن صورت حال سے نکلنے کے لیے وہ سائنس اور اس کی مصنوعات کے استعمال کو کم کرنے کی دعوت دے، تاکہ افراط پر مبنی رویوں کو دوبارہ توازن اور اعتدال پر لایا جاسکے تو ایسا شخص افراد اور معاشرے کا محسن ہے اور وہ ان کا بھلا چاہتا ہے لہٰذا اس کی حمایت کرنا عقل و دین دونوں کا تقاضا ہے۔ہمارے نزدیک ایسی آواز درحقیقت سنجیدہ اصلاح کی ایک قابل تحسین آواز ہے لیکن اگر کوئی شخص سائنس کے غیر متوازن و بہیمانہ استعمال اور کسی خاص علاقے اور عہد کے چند شیاطین (مغربی فلاسفہ) کی طرف سے سائنس کے اغوا کو بنیاد بنا کر سائنس وٹیکنالوجی کو مذہب دشمن اور کفر والحاد قرار دے کر اسے قابل رد ہونے کا اعلان کرے تو ایسا شخص ایک مہلک بیماری (دنیا پرستی) کا جو علاج تجویز کر رہا ہے وہ ایک اور مہلک بیماری (رہبانیت) کو جنم دینے کا باعث بن رہا ہے۔

زندگی اپنا سفر روکا نہیں کرتی: زندگی کے اس سفر میں انسان کے بہترین فطری معاون ''انسانی سوچ و کاوش'' اپنا وظیفہ ادا کرنا کسی حال میں ترک نہیں کرتے۔اب حاملانِ قرآن کا فرض یہ ہے کہ وہ زندگی اور اس کے اہم ترین معاونات ''سوچ و کاوش'' کو رہنمائی اور روشنی عطا کریں تاکہ اس سفر کی سمت درست رہے اور انسانی ''سوچ و کاوش'' کا وظیفہ درست طور پر انجام پاتا رہے۔

حیاتِ انسانی کی ایک ناگزیر رفیق و معاون: اکثر ایسا ہوتا رہا ہے اور جدید دنیا میں بھی تاریخ نے اپنی اس روایت کو دہرایا ہے کہ انسانی مسائل کے حل کے لیے وقوع پذیر ہونے والی ''سوچ و کاوش'' (سائنس) نے مذہبی طبقہ کے بانجھ پن، رہنمائی اور قیادت کی صلاحیت کے فقدان اور مذہب کی غیر معقول، مسخ شدہ اور منحرف شدہ تعبیرات اور اس تعبیر کے جبر و تشدد پر مبنی اطلاق کے ردِ عمل میں مذہب کا قلادہ ہی اپنی گردن سے اتار کر پرے پھینک دیا۔اس کے نتیجے میں نوعِ انسانی جن شدید اور نہ ختم ہونے والے مصائب و آلام سے دوچار ہوتی ہے اس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں اس مجرم مذہبی طبقہ اور ان کے ناخلف پیروکاروں کو دیتا رہا ہے جو انسانی 'سوچ و کاوش' یا 'عقل+علم+دولت' (عصرِ حاضر کی زبان میں سائنس و ٹیکنالوجی) کو خالص آسمانی ہدایت، رہنمائی اور روشنی عطا کرنے میں مجرمانہ غفلت ہی نہیں برتتا بلکہ آسمانی ہدایت کی مسخ شدہ، منحرف شدہ اور غلو پر مبنی تعبیرات کی تلوار لے کر انسانی زندگی کے سفر کے اس ناگزیر اور اہم ترین زادِ راہ اور متاع کو چھیننے اور اس کے آگے سدِ راہ بننے کی کوشش کرتا ہے جس کے بغیر انسانی زندگی اور تمدن کا سفر جاری رہنا ناممکن ہے۔

سائنٹزم...... ناکامی کی شاہراہ پر: چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دسویں صدی ہجری میں جب پوری دنیا میں مسلمانوں کے اقتدار اور علم کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن اپنے عین عروج کے زمانہ میں مسلمانوں نے انسانی سوچ و کاوش (سائنس) کی روحانی رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور دنیا کے مزوں اور اقتدار میں غافل ہوگئے۔واضح رہے کہ خالص مادی و دنیوی معاملات میں ''سائنس'' کی راہنمائی یہ ہے کہ اس کا استعمال انسانی فائدے کے لیے ہو اور اس کو شرک و ضرر سے پاک رکھنے کا انتظام کیا جائے۔اس بنیادی نگہبانی کے ساتھ اس کے آزادانہ نشو و نما کے ماحول کو تحفظ دیا جائے۔یہی وہ دورِ غفلت تھا جب شیطان نے انسان کی سوچ و کاوش/ ''عقل+علم+دولت'' (سائنس) کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔بعد کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ شیطان اپنے اس منصوبے میں کامیاب رہا۔لہٰذا اسی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف چار سو سال سے سائنس کا علمبردار مغربی دانشور سائنس اور مذہب کی دشمنی کا اعلان کر رہا ہے بلکہ عین اکیسویں صدی میں جب کہ مغرب کا دانشور سائنس کی مذہب دشمنی کے نظریہ کے مہلک ترین نتائج اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا ہے اور اس سے تائب ہونے کے لیے بالقوہ اسلام کے دروازہ پر پہنچ چکا ہے، پاکستان

میں ایک طبقہ علم و مذہب کا جھنڈا تھامے انسانی زندگی کے سفر کے ناگزیر اور بہترین معاونات (سائنس وٹیکنالوجی) کو اسلام کی ضد اور اسلام کا بدترین مخالف ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں نکلتا کہ(ا) مغرب کے جس انسان نے زندگی کے سفر کے بہترین معاونات ''سوچ و کاوش'' (سائنس) کا راستہ روکنے پر اپنے محبوب ترین مذہب کو اتار کر پرے پھینک دیا تھا وہ آج چار پانچ صدیوں کی صحرانوردی کے بعد جب ایک بار پھر اپنی حقیقی معبود کے آگے سجدہ ریز ہونا چاہتا ہے اور شرک کے غیر علمی عقیدے سے پاک مذہب کی آغوش میں آنے کے لیے بے تاب ہے،طبعاً وعقلاً وہ اسلام کے بے حد قریب آ گیا ہے،اسلام کے نادان دوست اسلام کی مسخ شدہ اور رہبانیت پر مبنی تعبیر کے ساتھ اس کے راستے کی دیوار بننا چاہتے ہیں۔اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا کہ وہ اسلام کے دروازے ہی سے واپس لوٹ جائے گا اور دوبارہ اپنے پرانے مذہب مسیحیت کی گود میں جا گرے گا کیونکہ مسیحیت نے کلیسا کے بدترین مظالم کی انسانیت سے معافی مانگ لی ہے اور اپنے آپ کو نہ صرف سائنس دوستی کے لیے پیش کر دیا ہے بلکہ سائنس کو قائدانہ کردار دینے پر بھی تیار ہے۔

انسانیت مذہب کے دروازے پر: جن مصنفین اور فلاسفہ کی کتابوں اور مقالہ جات وحوالہ جات سے زیر بحث فکر اپنی فکری بنیادیں تعمیر کرتی ہے اور سائنس کو اسلام کی بدترین مخالف اور اس کا اسلام سے ملاپ ناممکن قرار دیتی ہے، وہ وقت دور نہیں کہ مغرب کا علم وحقیقت کا متلاشی ذہن سائنسی تحقیق ہی کے نتیجے میں مغربی اغوا کاروں (سائنسی فلاسفہ) کی ان کتابوں اور افکار کو اٹھا کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دے گا اور اپنی روح کے مہیب اور بھیانک خلا اور پیاس کو بجھانے کے لیے مذہب کی طرف بے تابانہ لپکے گا۔وہ وقت قریب ہے کہ خدا کا اقرار، خدا کی وحی اور رسالت وآخرت کی شدید احتیاج سائنسی انسان کو مذہب کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے گی۔ایسے وقت میں جب کہ انسان اپنی سوچ و کاوش (سائنس) کی انتہا پسندیوں سے تنگ آ کر واپس اعتدال کی راہ ڈھونڈنا چاہے گا تو اسلام کی زیر بحث نمائندہ فکر اپنی سلبی سوچ اور غالی موقف کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے اپنا دروازہ بند کر لیتی ہے۔اور انسانی سوچ و کاوش (سائنس) کو فطری راستہ دینے، اس کی رہنمائی کرنے اور اسے انسانی مسائل میں ایک بہترین خدمت گار کے طور پر قبول کرنے کے اس پر کفر والحاد کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے۔نتیجتاً ایک ایسی ''رہبانیت'' پر مبنی اسلام کی منحرفانہ تعبیر کا علم بلند کرتی ہے جس کے اصولوں اور معیارات کو یہ خود بھی نہیں نباہ سکتی۔

زمین وآسماں نے اس سے زیادہ حسرتناک منظر شاید پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ مغرب کے انسان

کا اجتماعی ذہن جب مسیحیت کی مسخ شدہ اور غیر فطری تعلیمات کی خوفناک قید سے آزاد ہوا تو یہ بہترین وقت تھا کہ ان کے سامنے اسلام کا متوازن تعارف پیش کر کے انہیں اسلام سے ہم آغوش کر لیا جاتا لیکن اسلام کا درست تعارف نہ ہونے کی وجہ سے اور ابلیسی چالوں کے نتیجے میں پورا عالم مغرب لامذہبیت اور الحاد کی گود میں جا بیٹھا۔اب صدیوں کے نامرادسفر کے بعد ایک بار پھر یہ اپنے فرسودہ مذہب(Scientisim & Liberalism) سے نکلنا چاہتے ہیں اور مذہب کی آغوش میں واپس آنا چاہتے ہیں تو اسلام کے غلط تعارف کی وجہ سے ابلیس کو اسلام کے بارے میں بدترین متعصّبانہ پراپیگنڈہ کا موقع ہاتھ آجائے گا نتیجتاً ایک بار پھر صدیوں پر محیط ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد اسلام کا صحیح تعارف (فرسودہ مذہب یعنی سائنٹسزم کے پیروکار) سائنسی انسان تک نہ ہونے اور اسلام کے منحرفانہ اور مسخ شدہ تعارف سے وحشت زدہ ہوکر اور مغرب کا انسان لامذہبیت سے تنگ اور بیزار ہوکر سچائی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے تو سچ کے نمائندے غائب ہیں، جب کہ میدان میں جو موجود ہیں وہ انسان کی زندگی کے ناگزیر معاون اور زادراہ یعنی سائنس کو تسلیم کرنے ہی سے انکاری ہیں۔نتیجتاً انسانیت ایک بار پھر الحاد سے نکل کر مسیحیت کی گود میں بیٹھنے کے لیے پَر تول رہی ہے۔دنیا مذہب کی کس حد تک پیاسی ہے ہم ذیل میں ایک معروف امریکی جریدے ''بزنس ویک'' کی ۸ نومبر ۱۹۹۹ئ کے شمارہ کے ایک مضمون "Religion in the Workplace" کے درج ذیل نکات سے اس کی وضاحت کرنا چاہیں گے۔:

۱۔ امریکہ میں کام کی جگہوں پر 10,000 'بائبل اور دعائیہ' گروپ سرگرم ہیں۔

۲۔امریکہ کی بڑی بڑی کمپنیاں مثلاً Xerox، Taco Bell، Pizza Hut اور Wal-Mart Stores اپنے ملازمین کے روحانی ترفع کے لیے باقاعدگی سے سیشن منعقد کراتی ہیں۔

۳۔امریکہ میں ۴۸٪ امریکی ہر روز کام کی جگہوں پر مذہب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

۴۔ ۵۱ فیصد امریکی ہر روز ''دعا/عبادت'' کرنا چاہتے ہیں۔ (جاری ہے)

'جیو اور جینے دو'

ابلیس کا نعرہ ہے کہ میری اور میرے پیروکاروں کی خرمستیوں پر گرفت نہ کرو............

قرآن تو مومن کو تاحیات اس منصب پر مامور کرتا ہے کہ ان کا تعاقب جاری رکھے اور ان کو بے لگام کبھی نہ ہونے دے۔ **'قاتلوھم حتی لاتکون فتنه'**

(ڈاکٹر انعام اللہ، اٹک)

اسلام اور مغرب

فضل کریم بھٹی

مسلم معاشرے پر سیکولرازم کے اثرات

اور اہل علم و دانش کی ذمہ داری

فضل کریم بھٹی صاحب کا مضمون ہم دے تو رہے ہیں لیکن ہمیں ان کی بعض آراء خصوصاً ان کے اس رویے سے اتفاق نہیں ہے کہ وہ علماء پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ علماء خامیوں سے پاک ہیں یا مقدس گائے ہیں۔ یقیناً طبقۂ علماء کو بھی اصلاح کی ضرورت ہے لیکن اصلاح محبت سے ہوتی ہے نہ کہ طنز و اتہام اور سخت لہجے و تند زبان میں۔ پھر یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ علماء، جیسے بھی وہ ہیں، بہر حال ہمارے معاشرے میں دین کے نمائندے ہیں اور بقول ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم 'علماء کی ہوا خیزی دین کی ہوا خیزی ہے'۔ اس لیے ہماری رائے میں علماء اور دینی مدارس کے بارے میں بات کرتے ہوئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ دینی مدارس کے حلقے سے اگر کوئی صاحب ان کا جواب دینا چاہیں تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔

مدیر

کچھ عرصہ ہوا اخبار میں ایک تصویر چھپی تھی جس میں لاکھوں افراد کا اجتماع دکھایا گیا تھا جو شریعتِ اسلامیہ کے خلاف مظاہرہ کر رہا تھا کہ ہمیں شریعت نہیں چاہیے۔ یہ تصویر ترکی کے ایک بڑے شہر استنبول کے ایک مظاہرے کی تھی۔ یاد رہے استنبول صدیوں تک خلافتِ اسلامیہ کا دارالخلافہ رہا ہے اور استنبول کا اصلی نام اسلامبول تھا جو بعد میں تبدیل کر دیا گیا۔ استنبول مسلم اکثریت کا شہر ہے اور اس مظاہرے میں اکثریت مسلمانوں کی ہی خیال کی جاتی ہے جو مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمیں شریعتِ اسلامیہ نہیں چاہیے۔ میرے لیے یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مسلمان شریعت کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کریں، چنانچہ میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ یا تو تُرک اتنے بگڑ چکے ہیں کہ مسلمان ہوتے ہوئے شریعت کے خلاف

ہو گئے ہیں یا شریعت اتنی بگاڑ دی گئی ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی اور نا قابلِ عمل ہو گئی ہے حالانکہ اللہ کا دین تو قیامت تک کے لیے قابل عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کو دین مکمل ہو جانے کی نوید سنائی تھی اور اپنی نعمت تمام ہو جانے کا قرآن مجید میں اعلان کیا تھا اور اسلام کو بطور دین کے اپنی رضا مندی کی سند عطا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ترجمہ ''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھر پور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا۔'' (آیت ۳ سورۃ المائدہ، قرآن مجید ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی)۔ اس حالت میں جبکہ دین مادی اور روحانی زندگی کی بھر پور نعمتوں سے تمام تر مکمل ہے اور مکمل ضابطۂ حیات ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیوں دوسرے طریقۂ ہائے حیات کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں؟ کوئی مسلمان سیکولرزم کے پیچھے لگا ہوا ہے اور کوئی سوشلزم سے مشکل کشائی چاہتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام صحیح طور پر پیش نہیں کیا جا رہا۔

اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی ڈیڑھ ارب سے اوپر بتائی جاتی ہے جو مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا سے لے کر شمال مغربی افریقہ میں مراکو تک پھیلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے ستاون (۵۷) آزاد مما لک ہیں۔ دنیا کے کثیر ذرائع مسلمانوں کے پاس ہیں۔ وہ خوراک کے وسیع ذرائع رکھتے ہیں، ایندھن کے ذرائع از قسم تیل اور گیس وافر مقدار میں رکھتے ہیں، روئی، پٹ سن اور ربڑ موجود ہے۔ اِن سب کے باوجود وہ خستہ حال اور مفلس ہیں۔ دنیا کی بیشتر اقوام کمپیوٹر دور سے نکل کر انفارمیشن ٹیکنالوجی میں داخل ہو گئی ہیں۔ مغربی اقوام تو ہم سے کافی ترقی یافتہ تھیں۔ جاپان بھی پچھلی صدی کے شروع میں ہی ترقی یافتہ ہو گیا تھا۔ اب چین ہمارے سامنے تیس چالیس سال میں سُپر پاور بن گیا ہے۔ انڈیا جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے وہ جلد ہی ایک بڑی طاقت بن جائے گا۔

مسلمانوں کی موجودہ افسوس ناک حالت

مسلمان جس جگہ بھی ہیں انتشار اور خلفشار کا شکار ہیں۔ مسلمانوں کے ۵۷ آزاد مما لک ہیں لیکن کسی ملک میں بھی صحیح اسلامی قانون کی حکومت نہیں ہے۔ مسلمانوں میں ہر جگہ انتہا پسندی اور شدت پسندی ہے قرآن و سنت کی کہیں عمل داری نہیں۔ ایران کہنے کو تو اسلامی جمہوریہ ہے لیکن وہاں انتہا پسند اثنا عشری شیعہ فرقہ کے مُلّا حکمران ہیں۔ وہاں سُنیوں کی آبادی ۳۰ سے ۴۰ فی صد بتائی جاتی ہے لیکن سُنی اپنی مسجدیں نہیں بنا سکتے۔ وہاں غیر مسلموں کو سُنیوں سے زیادہ حقوق حاصل ہیں جو وہاں اپنی عبادت

گاہیں، چرچ اور مندر بنا سکتے ہیں۔ افغانستان میں طالبان اپنی تعبیر کا اسلام لائے تھے انہوں نے ملک کو طاقت اور بندوق سے فتح کیا۔ وہاں مسلم عوام الناس کو رائے دہی کا حق نہیں تھا لیکن انہوں نے ملک میں عدل وانصاف جلد اور سستا فراہم کیا، امن وامان کی حالت بہت اچھی کردی اور منشیات کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم اپنے چار پانچ سالہ دورِ اقتدار میں کوئی ترقیاتی کام نہ کر سکے اور جدید دور کے مطابق تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہ کر سکے۔ وہ افغانستان کو قرونِ وسطیٰ سے جدید دور میں داخل نہ کر سکے۔ پاکستان بھی آزادی کے ۶۵ سال بعد بھی اپنا قانون نہیں بنا سکا اور ہم ابھی تک انگریز کے قانون پر چل رہے ہیں۔ ملک میں ۹۵ فی صد مسلمان ہیں لیکن اُن کو توفیق نہیں ہوتی کہ موجودہ دور اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانون بنائیں۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کا وعدہ تھا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری بنائیں گے لیکن ہم اس طرف کوئی پیش رفت نہیں کر سکے۔ ہر فرقہ اسلام کی اپنی تعبیر رکھتا ہے اس لیے ہم اسلامی قانون نہیں بنا سکے۔ پاکستان کے مسلمانوں میں فرقہ بندی کی وجہ سے ہم شریعت کا قانون نہیں لا سکے۔ اِس کی بڑی وجہ ہمارے نظامِ تعلیم کی خرابی ہے۔

اس وقت ہمارا نظامِ تعلیم دینی مدارس اور جدید درس گاہوں پر مشتمل ہے۔ اسلام میں دین ودنیا کی تفریق نہیں۔ ہر مسلمان جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات یا قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزار رہا ہے وہ زراعت، صنعت وحرفت، سروسز یا کسی بھی حلال پیشے سے روزی کما رہا ہے وہ دین کے مطابق ہی ہے۔ اسی طرح ہمارا نظامِ تعلیم ماضی میں ایک ہی تھا اور صدیوں تک ایک ہی رہا لیکن جب انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو مغلیہ عہد کا نظامِ تعلیم ختم کر دیا اور اپنا نظامِ تعلیم قائم کر دیا۔ یہ سیکولر بنیادوں پر استوار تھا اور مسلمانوں کے مذہب، تہذیب وتمدن اور کلچر کے خلاف تھا اس لیے علماء نے اِس کی مخالفت کی اور اِس کا بائیکاٹ اور مقاطعہ کیا۔ انہوں نے منطقی اور دینی لحاظ سے یہ بالکل ٹھیک کیا لیکن وہ اِس سیکولر اور لادین نظامِ تعلیم کے خلاف مسلمانوں کو جدید حالات اور عصرِ حاضر کے مطابق ایسا نظامِ تعلیم اور نصابِ اسلامی تیار کر کے نہ دے سکے جو اُن کی وقت کے مطابق ضرورت پوری کر سکے۔ مسلمانوں کے اہلِ علم ودانش آغازِ اسلام سے علمائے اسلام یا علمائے دین ہی تھے جب قرونِ وسطیٰ میں بنوعباس کے دور میں یونانی، ہندوستانی اور ایرانی علوم وفنون کے تراجم ہوئے اور اُن کی وجہ سے منطق اور فلسفے کی راہ سے گمراہیاں پھیلنے لگیں تو علمائے اسلام نے جن میں امام غزالی، امام ابنِ تیمیہ، امام فخر الدین رازی اور بعض دیگر علماء شامل تھے بڑی محنت سے اُن گمراہیوں کا مقابلہ منطق، فلسفہ اور دوسرے فنون سیکھ کر کیا اور اُمتِ اسلامیہ کو سیدھے راستے پر رکھا جس سے نئے نئے فنون پیدا ہوئے جن میں ایک علم الکلام

بھی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے دور کے علماء ایسا نہیں کر سکے۔ ہمارے دور کے علماء نے جب دیکھا کہ مغربی اقوام نے ہمیں غلام بنالیا ہے اور اُن کے علوم وفنون بطور ایک حکمران قوم کے مسلمانوں میں پھیل رہے ہیں تو انہوں نے اِس میں عافیت جانی کہ اُن کی تعلیم کا بائیکاٹ کیا جائے اور مغربی علمی یلغار کا مقابلہ اس طرح کیا جائے کہ اپنے علیحدہ جزیرے بنالیے جائیں جن کو بعض حضرات اسلام کے جزیرے اور بعض حضرات اسلام کی قلعہ بندیاں کہتے ہیں۔ یہ وہ سوچ تھی جس کو منفی سوچ کہا جاسکتا ہے۔ اسی سوچ کا نتیجہ درس نظامی کے نصاب کو جاری رکھنا ہے۔ یہ نصاب مُلّا نظام الدین متوفی ۱۷۴۶ء نے تیار کیا تھا جو اُس وقت کی ضرورت کے مطابق بالکل ٹھیک تھا لیکن اب تک ہمارے دینی مدرسوں میں رائج ہے۔ یہ نصاب ۱۸۳۲ء میں از کارِ رفتہ اور فرسودہ ہو گیا جب لارڈ میکالے انگریزی نظامِ تعلیم لایا۔ اِس میں جتنی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ صدیوں پرانی ہیں۔ یہ نصاب مساجد کے پرانے ٹائپ کے آئمہ اور خطیب اور قدیم طرز کے مدرس اور مفتی تیار کرتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انہی مدرسوں کی وجہ سے مسجدوں میں اذانیں ہوتی ہیں اور اِسی سے اسلام زندہ ہے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ مسلم معاشرے کی زبوں حالی کو دیکھ کر تو ایسا معلوم نہیں ہوتا!

مولانا مودودی، ہمارے دور کے عظیم اسلامی مفکر تھے۔ انہوں نے اسلامی نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لیے اپنی زندگی میں کئی مضمون لکھے۔ وہ قدیم نظام کے بھی سخت مخالف تھے اور جدید نظام تعلیم کو بھی زہر سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں میں نظامِ تعلیم کی دوئی اور ثنویت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ قدیم نظامِ تعلیم کے متعلق وہ لکھتے ہیں ’’اب جو لوگ اس نظامِ تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تا کہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔ اس طرح ان کی ذات سے کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہنچتا ہے یعنی ان کی بدولت ہمارے اندر قرآن و دین کا کچھ نہ کچھ علم پھیلتا ہے، دین کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت لوگوں کو حاصل ہوتی ہے اور ہماری مذہبی زندگی میں کچھ نہ کچھ حرارت باقی رہ جاتی ہے لیکن اس کے فائدے کے مقابلے میں جو نقصان ہم کو پہنچ رہا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ وہ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں، نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں، نہ ان کے اندر اب یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں اور نہ وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اب ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کی بجائے الٹی اس میں کمی ہو رہی ہے۔ دین کی جیسی نمائندگی آج ان کے ذریعے سے ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دین سے روز بروز بُعد بڑھتا

جارہا ہے اور دین کے وقار میں کمی آرہی ہے۔ پھر ان کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا کیونکہ ان کی ضروریات زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو سرے سے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔''

(تعلیمات، صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸)

ملتِ اسلامیہ کی تاریخ اس چیز کی گواہ ہے کہ علمائے حق نے دین کی سربلندی کے لیے بڑی بے جگری سے قربانیاں دی ہیں اور جب اُن میں خرابیاں پیدا ہوئیں تو صوفیائے عظام نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کی صحیح رہنمائی کی لیکن مرورِ زمانہ سے ان دونوں میں زوال اور انحطاط آگیا اور تقلیدی جمود طاری ہوگیا جس کی وجہ سے مسلم معاشرے میں بڑی خرابیاں پیدا ہوگئیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنے عذاب کا کوڑا برسایا جس سے منگول، تاتاری اور صلیبیوں نے انہیں پامال کیا اور اُن کے کئی ممالک برباد کردیے اور بڑے بڑے شہر ویران کردیے۔ مسلمان کچھ عرصے کے لیے سنبھلے لیکن پھر زوال کا شکار ہوگئے اور آخر مغربی اقوام نے اُن کو غلام بنالیا۔ غلامی کے بعد علماء کی سوچ منفی ہوگئی اور وہ ملتِ اسلامیہ کی صحیح رہنمائی نہ کرسکے۔ ملتِ اسلامیہ کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ پاکستان اور ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں مثبت اور تخلیقی سوچ نہ اپنا سکے۔ اُن کے سامنے مغرب کی اقوام ترقی کررہی تھیں لیکن مسلمان علماء نے اُن سے کچھ نہ سیکھا بلکہ عصرِ حاضر سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر انہوں نے اپنے گرد تقدس اور بزرگی کا ایسا ہالہ بنالیا کہ ہم قرآن اور حدیث پڑھتے پڑھاتے ہیں اس لیے ہمیں کسی سے کوئی چیز سیکھنے کی ضرورت نہیں اور وہ قرونِ وسطیٰ کی تفسیریں، اُن کے حاشیے اور شرحیں پڑھتے پڑھاتے رہے۔ اُن کے نزدیک دنیا کی گردش اٹھارویں صدی میں آکر رُک گئی تھی حالانکہ اللہ تعالیٰ کا دین تو قیامت تک ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ زمانے کی گردش کے ساتھ نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جس کے لیے قرآن و حدیث کی روشنی میں حل مل سکتا ہے لیکن جن کے لیے ابھی تک دنیا کائنات کا محور ہے وہ زمانے کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں؟ آخر جب علماء مسلم عوام کے مسائل حل نہ کرسکے تو پھر عوام نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنا شروع کردیا اور وہاں سے سرسید احمد خان جیسے لوگ سامنے آئے اور ہم میں دین و دنیا کی تفریق پیدا ہوگئی اور مسلم معاشرہ تقسیم کا شکار ہوگیا۔

ہمارے دور میں مسلم معاشرہ عجیب انتشار کا شکار ہے۔ ہم میں ایسے علماء تقریباً ناپید ہیں جو دین

و دنیا کے جامع ہوں۔ قدیم مدرسے قدیم علماء تیار کرتے ہیں لیکن وہ جدید علوم وفنون سے نابلد ہیں۔ کسی زمانے میں مسلم عوام، علمائے اسلام اور اولیاء عظام کے گرویدہ تھے۔ جہاں کہیں ایسے بزرگ وعظ ونصیحت کے لیے آتے تھے ہزاروں مسلمان اکٹھے ہوجاتے تھے۔ اب علماء اور مسلم عوام میں اتنا بُعد پیدا ہوگیا ہے کہ مسلم عوام علماء کو اپنا رہنما اور ہادی نہیں سمجھتے بلکہ اُن کو علماء ہی نہیں سمجھتے۔ اِسی طرح علماء نے بھی اپنا کبھی احتساب نہیں کیا۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ہم قرآن وحدیث کے عالم فاضل ہیں اس لیے ہم غلطی کر ہی نہیں سکتے۔ اس طرح جو تقدس مآب بن جائے وہ کب کسی کی سنتا ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کے نام لیوا پادریوں نے بھی عیسائیت کو اپنی مرضی کا مذہب بنالیا اور یہی المیہ ملتِ اسلامیہ کو پیش آیا۔ جس کو ہم اسلامی قانون، شریعتِ اسلامیہ یا شریعت کہتے ہیں اُس کا حشر کچھ ایسا ہی ہوا۔ تُرکی میں جب خلافتِ اسلامیہ کی اصلاح کی کوشش کی گئی تو تنگ نظر علماء اور جاہل صوفیوں نے اُس کی سخت مخالفت کی۔ یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبّہ بالنصاریٰ قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ کا استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ یہ وہ اسلام تھا جو اُس وقت کے علماء اور صوفیا پیش کررہے تھے جس کا نتیجہ سیکولرازم کی شکل میں سامنے آیا۔ اس طرح تُرک مسلمان ایسی شریعت سے جو تنگ نظر علما اور جاہل صوفیا کی ایجاد تھی، اتنا تنگ پڑے کہ وہ اسلام کو ہی چھوڑ بیٹھے۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال کی ڈکٹیٹر شپ نے ہزاروں ایسے علما اور صوفیا کو تہہ تیغ کردیا اور ہزاروں قید کر لیے گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے جب ایسی جاہل اور نافرمان نسلیں ختم ہوگئیں تو اب تُرکی میں انقلاب آرہا ہے اور نئے دین دار لوگ تُرکی کو دین کی طرف پلٹا کرلے جارہے ہیں۔

پچھلے سال عرب ملکوں میں جو آزادی کی لہر چلی ہے وہ عرب سپرنگ مشہور ہوئی۔ اس میں مصر، لیبیا اور تیونس میں تو جمہوری حکومتیں آگئی ہیں لیکن شام میں نصیری شیعہ فرقہ شام کی اکثریت سُنی آبادی کا قتلِ عام کررہا ہے۔ ایران اور لبنان کے شیعہ بشارالاسد کی پُشت پر کھڑے ہیں اور اُس کی مدد کی جارہی ہے۔ ایران اکاون (۵۱) فی صد بحرینی شیعوں کی مدد جمہوریت کے نام پر کررہا ہے لیکن اسّی فیصد شامی سُنیوں کے خلاف نصیری فرقے کی مدد کرتے ہوئے جمہوری اصولوں کو بھول جاتا ہے۔ مسلمانوں کی بربادی کے دو عناصر ذمہ دار ہیں ایک قومیت اور وطنیت اور دوسرے مذہبی تفرقہ بازی۔ جب تک ہم اِن دو خطرناک بیماریوں سے نجات نہیں حاصل کریں گے ہم دوسری قوموں کے دستِ نگر

اور پسماندہ ہی رہیں گے۔ (جاری)

اسلام اور مغرب

عابد اقبال

مغرب کی ذہنی غلامی اور اقبالؒ

حقیقت یہ ہے کہ ہم آزاد ملک حاصل کرنے کے ۶۵ سال بعد بھی ابھی تک ذہنی اور فکری طور پر گوری چمڑی والوں سے آزادی حاصل نہیں کر سکے۔ آج بھی انگریز کی زبان اور اس کا لباس ہمارے لیے زیادہ قابل عزت ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی تہذیب ہماری تہذیب سے بہتر ہے اور اس کا زندگی گزارنے کا ڈھنگ ہم سے اعلیٰ ہے یہ ذہنی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟ جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا ؎

بند بر پا نیست بر جان و دل است
مشکل اندر مشکل اندر مشکل است

غلامی کی بیڑیاں ہمارے پاؤں میں نہیں بلکہ دل و دماغ پر پڑی ہیں اور تمام مشکلوں کی اصل مشکل یہی ہے۔ غلامانہ سوچ اور غلامی پر آمادگی سے اقبال کو اس قدر نفرت تھی کہ وہ غلامی کی زندگی گزارنے اور غلامی کی خُو رکھنے والے کو کتے سے بھی بدتر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگ پیشِ سگ سرخم کرد

یہ غلامی کی خو تو کتے سے بھی بدتر ہونے کی علامت ہے اس لیے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی کتے نے کسی دوسرے کتے کے آگے سر جھکایا ہو۔ پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

بگوشم آمد از خاکِ مزارے
کہ در زیرِ زمیں ہم می تواں زیست
نفس دارد و لیکن جاں ندارد
کسے کو بر مرادِ دیگراں زیست

میں ایک قبر کے قریب سے گزرا تو مُردے کی آواز آئی کہ قبر کے اندر بھی زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن اس شخص کی جو غلامی کی زندگی جی رہا ہے سانس تو چل رہی ہے لیکن درحقیقت اسے 'زندہ' کہلانے کا حق

حاصل نہیں۔ اقبال کی غلامی سے اسی نفرت اور اپنی قوم کی غلامی پر رضامندی ہی نے ان کو خدا سے اس شکوے پر مجبور کر دیا تھا ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

اتحاد امت

ثاقب اکبر

بین المسالک تکفیر غلط ہے

پاکستان کے سارے مکاتب فکر کے ثقہ اور معتدل مزاج علماء کرام باہمی تکفیر کو غلط قرار دیتے ہیں۔ یہاں ہم مختلف مکاتب فکر کے علماء کی آراء درج کر رہے ہیں۔

حنفی بریلوی مکتب فکر

مولانا صدیق ہزاروی ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جو کسی کلمہ گو کو مشرک یا بدعتی قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں لکھا:

''اہل سنت (بریلوی) کسی کلمہ گو کو مشرک اور بدعتی قرار نہیں دیتے اور کسی نئے اچھے کام کو بدعت حسنہ سمجھتے ہیں جبکہ قرآن وسنت سے متصادم نئے کام کو بدعت سیئہ قرار دیتے ہیں، اس کی مذمت کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں جس بدعت کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی بدعت سیئہ ہے۔

حنفی دیوبندی مکتب فکر

اس سلسلے میں مولانا اللہ یار خاں اپنا نقطۂ نظر اختصار کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں:

''ہم کسی مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔ جب تک وہ ضروریات دین میں سے کسی ایک کا منکر نہ ہو''۔ (۱)

اس ضمن میں یہ سوال بھی اہمیت رکھتا ہے کہ کیا کوئی مسلمان ارتکاب گناہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے یا نہیں، اس سوال کا جواب مولانا اللہ یار خان کی اس عبارت میں موجود ہے:

''ارتکاب گناہ کی وجہ سے ہم کسی مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔ البتہ گناہ گار بغیر توبہ کے مر گیا تو پھر بھی سزا بھگت کر جنت میں جائے گا''۔(۲)

۱۔ اللہ یار خان، عقائد وکمالات علمائے دیوبند، ادارہ نقشبندیہ اویسیہ، دار العرفان، منارہ ۱۹۹۹ء ص ۲۶
۲۔ ایضاً ص ۱۳، ۱۴

مولانا محمد خان شیرانی نے اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایمانیات مجمل ہیں مثلاً شرک قبیح ہے یا بدعت قبیح ہے۔ قرآن وسنت سے یقینی طور پر یہ اجمال ثابت ہے۔ ان کی تفصیلات اجتہادی اور فنی ہیں، ایمانیات میں شمار نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی مسلمان کسی عمل کو شرک یا بدعت سمجھے تو نہیں کرے گا اور نہ ہی کرنا چاہیے لیکن اگر وہ اپنے اجتہاد یا معلومات کے مطابق کسی عمل کو شرک یا بدعت نہ سمجھے تو پھر اس کی اپنی مرضی ہے۔ نیز ہر اجتہاد کی پابندی خود مجتہد پر تو واجب ہے لیکن اس کے اجتہاد کو دوسروں پر تحمیل کرنا اس کا حق نہیں۔ فتوے ہمیشہ تحمیل کے میدان میں لگتے ہیں، عمل کے میدان میں نہیں لگتے۔ اگر کوئی مجتہد خود اپنے اجتہاد پر عمل کرے اور دوسروں پر تحمیل نہ کرتے تو فتوے کی نوبت نہیں آئے گی۔ فتوے کی نوبت تب آئے گی جب کوئی مجتہد یا عالم یہ کہے کہ میرے اجتہاد یا علم کو ضرور مان لو۔ تقلیدی ایمان دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شک ڈلوانے والا ٹکرا جائے تو اس کے ایمان میں تزلزل آئے گا۔ یہ ایمان بہ اتفاق علماء قابل قبول نہیں لیکن اگر ایک شخص اس تقلیدی ایمان میں اتنا مضبوط و مستحکم ہو کہ کسی بھی صورت اس میں تزلزل واقع نہ ہو تو اس کو بھی امام ابوحنیفہؒ کے سوا دوسرے آئمہ کرام ایمان تسلیم نہیں کرتے۔ خود امام ابوحنیفہؒ بھی مقلد کے ساتھ اپنے ایمان کی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے اسے گناہ گار سمجھتے ہیں۔ نیز علم کلام کے جتنے اختلافات ہیں وہ ذات باری اور صفات باری کے بارے میں ہیں جبکہ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ کی مصنوعات میں غور کرو، ذات میں نہیں۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ (الشوریٰ ۴۲:۱۱)

انسان کی مصنوعات کسی اور سیارے کی مخلوق کے پاس پہنچ جائیں جبکہ وہ خود انسان کی ذات اور

صفات سے واقف نہ ہو، اور اس کی ذات اور صفات کا اندازہ اس کی مصنوعات سے لگائے تو ہر اندازہ غلط ہوگا۔ اس کا ایک ہی جواب ہوگا کہ یہ سب انسان کی بنائی ہوئی مصنوعات ہیں خود انسان ان جیسا نہیں، یہی جامع جواب ہوگا۔ تفصیلات میں جس قدر جائیں گے غلط ہوگا۔

نیز یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مطابق ایمان بسیط ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس جو دو چیزوں کا نقد سرمایہ ہے، وہ ہے جان اور مال اور وہ ان دونوں میں منافع کی غرض سے تصرف کرتا ہے تو یہ ہے ''تجارت'' جبکہ ایمان ''عقد بیعہ'' ہے انسان کی جانب سے جان اور مال کا، اللہ کے ساتھ اور اعمال ''تسلیم مبیعہ'' ہے لہٰذا ایمان ''عقد بیعہ'' بسیط ہے، اعمال اس کا جز نہیں ہیں۔ البتہ ایمان ''تسلیم مبیعہ'' ہے جو قیمت کے لیے شرط ہے۔

توحید اور شرک اصولی باتیں ہیں، مثلاً قرآن حکیم میں ہے:

یَآیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (البقرہ ۲: ۲۱)

یعنی تمام انسانیت کا دو باتوں پر اتفاق ہے ایک خلق یعنی نیست سے ہست کرنا اور دوسرا رزق یعنی زندگی کے وسائل کی فراہمی، یہ دونوں اللہ سے مختص ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ دو مزید باتیں ماننی پڑیں گی: ایک ہدف اور دوسرے استعمال۔ یہ ہدایات کے اس مجموعے میں اللہ نے بتائے ہیں جس کا نام قرآن ہے۔ اگر اشتباہ ہے تو قرآن کے بارے میں ہوسکتا ہے کہ یہ خالق کی جانب سے ہے یا بندے نے خود بنایا ہے۔ اس کی آزمائش کا راستہ یہی ہے کہ کوئی سورت اس جیسی بنا لاؤ۔ جب ثالث کی نوبت آئے گی کہ تمہاری بنائی ہوئی سورت اس کی ہم پلہ ہے یا نہیں تو وہ مجھ پر نہ چھوڑیں چونکہ میں فیصلہ کروں گا تو فیصلہ پھر اسی راستے سے بھیجوں گا تو پھر اسی مشکل میں رہو گے، جس میں اس وقت ہو لہٰذا اپنی معاونت اور ثالثی کے لیے بھی ''وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ'' (البقرہ ۲۳: ۲) جو تمہارے خطبوں اور قصیدوں کے نمبر لگاتے ہیں، ان سے فیصلہ لو اگر وہ آپ سے کہیں کہ تمہارا بنایا ہوا سورہ اس سورہ کے ہم پلہ ہے تو تب بھی نہ مانو لیکن نہ کرسکو اور رہتی دنیا تک نہ کرسکو گے پھر تو مان لو کہ جو میں خالق ورازق ہوں اپنے خلق ورزق کے ہدف اور استعمال کا مجموعہ میں نے بھیجا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ یقین رکھے اور اقرار کرے کہ خلق اور رزق دونوں اللہ کے ہیں، ہدف اور استعمال وہی خالق ورازق مجھے بتائے گا اور اس نے بتایا ہے۔ ہدایات کا مجموعہ یہ کتاب ہے جو قرآن ہے اور اس کا عملی نمونہ نبی ﷺ کی سیرت اور سنت ہے۔ اب اس کے بعد کیا اسے ہم موحد کہیں گے یا اس سے انتظار کروائیں گے کہ فلاں مجتہد یا عالم نے

ہدایت کے اس مجموعے سے اور نبی ﷺ کی سیرت وسنت سے جس قسم کا ذہن زندگی کی روش کے لیے بنایا ہے اگر من وعن اسے تسلیم کرو گے تو موحد رہو گے ورنہ مشرک بن جاؤ گے؟ تو یہ توحید وشرک اللہ کی الوہیت میں ہوگا یا عالم کے علم میں ہوگا؟

اہلِ حدیث مکتب فکر

شیخ عبداللہ بن عبدالحمید اثری نے اپنی کتاب ''الوجیز فی عقیدۃ السلف الصالح اہل السنۃ والجماعۃ'' میں مسئلہ تکفیر کے بارے میں اپنا نظریہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

عقیدۂ سلف صالحین اہل السنہ والجماعۃ اہل الحدیث کے اصول میں سے ایک اصلِ ثالث یہ بھی ہے کہ: ''وہ اہل اسلام میں سے کسی بھی خاص شخص کو کافر قرار نہیں دیتے کہ جو ایسے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے جس سے کفارہ لازم آتا ہو، الّا یہ کہ: اُس حجت ودلیل کے قائم ہو جانے کے بعد کہ جس دلیل وحجت کا تارک (صراحتاً) کفر کررہا ہو چنانچہ (۱) اس ضمن میں شروط بھی وافر پائی جائیں (۲) اس کے کفر میں داخل ہونے کی تمام رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں (۳) اپنے کسی فہم کا مطلب بیان کرنے والے اور جاہل آدمی سے شک وشبہ بھی زائل ہو جائے۔

اور یہ بات معلوم ہے کہ ایسا پوشیدہ امور میں ہوگا کہ جو کشف وبیان کے محتاج ہوں، بخلاف ظاہری امور کے، جیسے کہ: اللہ عزوجل کی ذات اقدس کے وجود کے متعلق دانستہ طور پر انکار کرنا اور نبی مکرم ﷺ کی تکذیب کرنا اور آپ ﷺ کی ختم نبوت اور تاقیامت صرف آپ کی ہی رسالت کا جان بوجھ کر انکار کرنا۔

اور یہ کہ اہل السنۃ والجماعۃ سلفی جماعت حقہ کے لوگ ایسے آدمی کو کافر قرار نہیں دیتے جو کفریہ الفاظ وافعال ادا کرنے پر مجبور ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مکمل طور پر مطمئن ہو اور نہ ہی وہ مسلمانوں میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں اگرچہ اس گناہ کا تعلق کبائر سے ہی کیوں نہ ہو۔ مگر یہ ہے کہ یہ گناہ شرک ہو۔ پس ایسی حالت میں وہ ایسے کسی گناہ کا ارتکاب کرنے والے پر کفر کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ بلا شک وشبہ وہ اس پر فسق اور ایمان کے ناقص ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں الّا یہ کہ جب تک اس کا گناہ اس پر کفر کے فتویٰ کو جائز نہ کردے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا۔ (النساء۴۸:۴)

''بے شک اللہ شرک کوتو بخشنے والانہیں اور شرک کے سوا(جو گناہ ہیں) جس کو چاہے بخش دے (اور جس کو چاہے نہ بخشے، عذاب کرے) اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے بڑا گناہ باندھا۔''

اور دوسرے مقام پر اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی قدر ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (الزمر ۵۳:۳۹)

''(اے پیغمبر ﷺ) کہہ دے (اللہ عزوجل فرماتے ہیں:) میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ کی مہربانی سے ناامید نہ ہو، کیونکہ اللہ سب گناہوں کو(شرک کے سوا) بخش دیتا ہے، بے شک وہی (بڑا) بخشنے والا مہربان ہے۔''

اور اہل السنہ والجماعۃ، سلفی جماعت حقہ کے لوگ کسی بھی آدمی پر کسی بھی گناہ کی وجہ سے کفر کا حکم صادر نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب وسنت سے اس بات پر دلیل نہیں لے لیتے کہ یہ فعل واقعتا کفر کا فعل وقول ہے اور جب بندے کی موت اسی حالت میں واقع ہو جائے یعنی کسی بھی عالم کو ایسی کوئی بھی دلیل نہ مل سکے کہ جس فعل وقول کا اُس نے ارتکاب کیا تھا وہ صراحتاً کفر تھا تو اس کا معاملہ اللہ رب العالمین کے سپرد ہوگا۔ اگر وہ چاہے تو اس کو عذاب دے اور اگر چاہے تو وہ اس کو معاف کر دے۔ اہل السنہ والجماعۃ سلفی جماعت حقہ کا یہ موقف ومنہج ان گمراہ فرقوں کے بالکل خلاف وبرعکس ہے جو کبیرہ گناہ کے مرتکب پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایما امری قال لاخیه: یا کافر، فقد باء بها احدهما ان کان کما قال: والا رجعت علیه۔''

وقال: ''من دعا رجلا بالکفر، او قال: عدوا اللّٰه! ولیس کذلک الا حار علیه''(۱)

جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی کو، اے کافر! کہہ کر پکارا تو دونوں میں سے ایک پر کفر آجائے گا۔ اگر وہ شخص کہ جسے اُس نے کافر کہہ کر پکارا ہے وہ واقعتا کافر ہے، تو پھر ویسا ہی ہے جیسا اُس نے کہا۔ بصورت دیگر یہ کفر پکارنے والے پر لوٹ آئے گا اور پھر فرمایا کہ: جو شخص کسی کو کافر کہہ کر پکارے یا کہے: او اللہ کے دشمن! حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے تو کفر اس پکارنے والے پر پلٹ آئے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے خود سماعت کی: رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

''لا یرمی رجل رجلا بالفسوق، ولا یرمیه بالکفر، الا ارتدت علیه، ان لم یکن صاحبه کذلک''۔

وقال: ومن قذف مومنا بکفر: فھو کقتله۔

۱۔ رواہ المسلم، کتاب الایمان، حدیث ۲۱۶، ۲۱۷

وقال: اذا قال الرجل لاخیه: یا کافر فقد باء به احدھما(۱)۔

''کوئی بھی (مسلمان) آدمی کسی دوسرے (مسلمان) آدمی پر راہ حق سے انحراف کی تہمت نہ دھرے اور نہ ہی اُس پر کفر کی تہمت دھرے۔ اگر وہ حقیقت میں کافر وفاسق نہ ہوا تو خود کہنے والا فاسق اور کافر ہو جائے گا۔''

اور پھر فرمایا کہ: اور جو کسی مسلمان آدمی پر کفر کی تہمت لگائے گا (اور وہ کافر نہ ہو) تو ایسا ہے جیسے اس کا خون کیا۔'' اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''جب کسی آدمی نے اپنے (مسلمان) بھائی کو 'اے کافر! کہا تو دونوں میں سے ایک ضرور کافر ہوگا۔''

اور اہل السنۃ والجماعۃ سلفی جماعت حقہ، اہل بدعت پر معصیت یا کفر کا مطلق طور پر حکم لگانے اور کسی معین شخص پر کہ جس کا اسلام بالیقین ثابت ہو ...... اور اس سے کسی بدعت کا ارتکاب ہو جائے ...... اس طرح کا کوئی حکم لگانے کے درمیان ہمیشہ فرق کیا کرتے ہیں، کہ ایسا شخص تو بلا شک وشبہ گناہ گار ہوگا یا پھر راہ حق سے انحراف کرنے والا (فاسق) یا پھر کافر۔ چنانچہ...... اس آدمی پر وہ ان تینوں میں سے کوئی بھی حکم تب تک نہیں لگاتے حتیٰ کہ اس پر حق واضح ہو جائے اور وہ بھی دلیل وحجت قائم کر کے اور شک وشبہ کا ازالہ کر کے اور اس معاملہ کا تعلق خفیہ امور سے ہے نہ کہ ظاہری امور سے۔ پھر وہ کسی معین آدمی کی تکفیر نہیں کرتے مگر یہ کہ جب اُس میں کفر والی تمام شروط متحقق ہو جائیں اور اس ضمن میں تمام موانع دور ہو جائیں۔

سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ: میں نے خود سماعت کیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کان رجلان فی بنی اسرائیل متواخیین، فکان احدھما یذنب، والاخر مجتھد فی العبادة، فکان لا یزال المجتھد یری الاخری علی الذنب، فیقول: اقصر، فوجدہ یوما علی ذنب: فقال له: اقصر، فقال: خلنی وربی

ابعثت علی رقیبا؟فقال: واللّٰہ لا یغفر اللّٰہ لک۔ او لا یدخلک اللّٰہ الجنۃ! فقبض ارواحھما، فاجتمعا عند رب العالمین، فقال لھذا المجتھد: اکنت بی عالما، او کنت علی مافی یدی قادرا؟ وقال للمذنب: اذھب فادخل الجنۃ برحمتی، وقال للآخر: اذھبو بہ

۱۔ رواہ البخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر ۵۰۴۶، ۷۰۴۶، ۶۱۰۳

الی النار۔ قال ابو ھریرۃ: والذی نفسی بیدہ! لتکلم بکلمۃ او بقت دنیاہ وآخرتہ(۱)۔

''بنواسرائیل میں دوآدمی باہم بھائی بنے ہوئے تھے۔ان میں سے ایک گناہ کا ارتکاب کربیٹھتا تھاجب کہ دوسرا آدمی عبادت میں بہت محنت کرنے والا تھا۔ چنانچہ عبادت میں محنت کرنے والا اپنے دوسرے ساتھی کو ہمیشہ گناہ کرتے ہوئے دیکھتا تو اُس سے کہتا: باز آجاؤ۔ایک دن اس نے اسے ایک گناہ کرتے ہوئے پکڑلیا۔اس سے وہ کہنے لگا: باز آجاؤ۔ وہ شخص اُس عبادت گزار سے کہنے لگا: آپ میرے اور میرے رب کے درمیان مداخلت نہ کریں۔کیا آپ میرے اوپر نگران بنا کر بھیجے گئے ہیں؟ وہ عبادت گزار کہنے لگا: اللہ کی قسم! اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یا اس نے یوں کہا کہ: اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی بھی جنت میں داخل نہیں کرے گا اور پھر جب دونوں فوت ہوگئے تو وہ دونوں اللہ رب العالمین کے ہاں اکٹھے ہوئے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس محنتی عبادت گزار سے کہا: کیا تجھے میرے متعلق علم تھا؟ یا تُو اس پر جو میرے ہاتھ میں اختیار ہے اُس پر قدرت رکھتا ہے؟ اور پھر گنہگار سے فرمایا: جاؤ تم میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ اور دوسرے کے میں بارے میں فرمایا: اسے جہنم میں لے جاؤ۔سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے تھے: اُس ذات اقدس کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اُس شخص نے ایک ایسی بات کی جس نے اُس کی دنیا بھی تباہ کردی اور اُس کی آخرت بھی۔''

اہل تشیع کی رائے

اس حوالے سے مولانا سید افتخار حسین نقوی نے کہا:

مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تکفیر سے اجتناب کرنا چاہیے، یہ بہت خطرناک عمل ہے۔ ماضی میں

خوارج کی یہی روش رہی ہے۔ اگر ہر مسلک ایک دوسرے کو کافر قرار دینے لگے تو کوئی مسلمان نہیں بچے گا۔ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے یہ دعوت دی:

"قولو الا الہ الا اللّٰہ تفلحوا"۔

یعنی لا الہ الا اللّٰہ کہو اور فلاح پا جاؤ۔

۱۔ صحیح سنن ابی داؤد، للالبانی، کتاب الادب، باب النہی عن البغی، حدیث ۴۹۰۱

تبصرۂ کتب ڈاکٹر محمد امین

توہین رسالت کا مسئلہ

اور عمار خان ناصر

از مولانا ڈاکٹر مفتی عبد الواحد

یہ ۶۱ صفحے کا ایک کتابچہ ہے جو مفتی صاحب نے عمار خان ناصر (مدیر ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ) کی کتاب 'توہین رسالت کا مسئلہ' کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔ مفتی صاحب نے کتابچے کے تعارف میں لکھا ہے کہ "عمار ناصر صاحب کی کتاب کا موضوع یہ ہے کہ ذمی یعنی مسلمان ملک کا کافر شہری اگر توہین رسالت کا ارتکاب کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟" انہوں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ 'اس تنقیدی جائزے سے غرض کسی خاص واقعہ یا مقدمہ سے متعلق کچھ لکھنا نہیں ہے بلکہ غرض صرف اتنی ہے کہ عمار خاں صاحب نے اپنی کتاب کے ذریعے سے جو مغالطے دینے کی اور امت میں انتشار پھیلانے کی جو کوشش کی ہے، اس کا توڑ ہو سکے اور لوگ ان کے مغالطوں کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔"

اس مسئلے میں علمی اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ علماء امت اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی نبی کریم ﷺ کی توہین کرے (اختلاف نہیں توہین، اختلاف اور چیز ہے جس کی گنجائش نکلتی ہے) تو یہ ایک جرم ہے (کیونکہ اس سے مسلمانوں کے بنیادی عقیدے کو ٹھیس پہنچتی ہے اور چونکہ وہ نبی کریم ﷺ سے شدید محبت کرتے ہیں لہذا انہیں اذیت پہنچتی ہے، ان میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ قتل و غارت اور فساد ہوتا ہے) اس لیے یہ جرم کرنے والا بڑی سے بڑی سزا (یعنی سزائے موت) کا مستحق ہے جیسا کہ خود آنجناب ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ثابت ہے۔ تاہم احناف میں سے بعض لوگوں نے یہ کہا

ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ہو اور دوران اختلاف ومناقشہ اگر اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو آنحضرت ﷺ کی تکریم کے خلاف ہو اور یہ آدمی اس پر معذرت کرے، آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کرے اور وہ اس کا عادی نہ ہو اور نہ یہ اس کی پلاننگ ہو تو ایسے آدمی کی معافی قبول کی جاسکتی ہے یا اسے کوئی ہلکی سزا دی جاسکتی ہے۔ یہ رائے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بعض علماء احناف کی ہے جب کہ علمائے امت کی بہت بڑی اکثریت (یعنی ائمہ ثلاثہ، اہل حدیث، اہل تشیع اور اکثر احناف) کی رائے یہ ہے کہ توہین رسالت کا مرتکب مستحق سزائے موت ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی۔ اور یہ بات پہلی ملتوں میں بھی تھی اور اسلام میں بھی ہے کہ جو بڑے اور قبیح جرائم ہیں ان کے مرتکب کو سخت سزا دی جائے تاکہ ابلیسی خصلت رکھنے والے لوگ اس سزا سے ڈریں، عبرت پکڑیں اور اس جرم سے باز رہیں۔

مذکورہ رائے پہلے بھی معمولی اقلیت کی رائے تھی اور اب جب کہ پاکستانی عوام اور علماء کی رائے وخواہش کے مطابق پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں اور پارلیمنٹ نے جمہور امت اور جمہور علماء کی رائے کے مطابق پاکستان میں توہین رسالت کی سزا 'سزائے موت' ہونے کا قانون پاس کردیا ہے تو بات ختم ہوگئی اور اس اختلاف رائے کی اہمیت محض ایک علمی نکتے کی رہ گئی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ جب پاکستان میں توہین رسالت کی سزا کا قانون پاس ہوگیا تو اہل مغرب نے (جن کی تہذیب کی بنیاد انسانی خواہشات وہوا پرستی پر ہے اور وہ سماوی ادیان اور اسلام کے اس فلسفے کو نہیں مانتے کہ انسانی معاشرے کے خلاف بڑے اور قبیح جرائم کی سزا سخت ہونی چاہیے اور اس کے اس فلسفے کا نتیجہ خود مغرب میں یہ نکلا ہے کہ وہاں جرائم کی شرح ساری دنیا سے زیادہ ہے اور معاشرہ فساد فی الارض میں مبتلا ہے) اس کی مخالفت شروع کردی اور اسے ظالمانہ اور کالا قانون اور انتہا پسندی اور دہشت گردی کا قانون قرار دینے کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ امریکی اور یورپی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اور ان کی حکومتیں علی الاعلان اس قانون کو ختم کرنے یا سزا کو نرم کرنے کا مطالبہ کرتی رہیں اور کررہی ہیں۔ اس کے لیے انہیں پاکستانی معاشرے سے بھی مدد درکار تھی چنانچہ بعض اطلاعات کے مطابق پاکستانی میڈیا (خصوصاً ایک خاص میڈیا گروپ میں) بھاری سرمایہ کاری کی گئی جس نے 'ذرا سوچیے!' اور طرح طرح کی پُرفریب ٹیکنیکس سے توہین رسالت کی سزا (سزائے موت) کے خلاف محاذ آرائی شروع کی خصوصاً جب آنجہانی گورنر پنجاب کو اس کے ایک محافظ نے توہین رسالت کے جرم میں اشتعال میں آکر قتل کردیا (اب عدالت نے بھی یہ تسلیم کرلیا ہے کہ سابق گورنر نے یہ جرم کیا تھا) تو اہل مغرب اور اس کے پاکستانی ہم نواؤں کو اس قانون کے خلاف مکروہ پروپیگنڈے

کا موقع مل گیا۔ انہیں اپنی مدد کے لیے پاکستان کے ہزاروں علماء کرام اور سکالرز میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو ان کی حمایت کرتا سوائے جاوید غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں خصوصاً جناب عمار خان ناصر صاحب کے اور ان کے پاس بھی کوئی دلیل یا علمی نکتہ نہیں تھا کیونکہ ساری امت پچھلے چودہ سو سال سے اس امر پر متفق ہے کہ اگر کوئی بدبخت مسلمان آنجناب ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو وہ مستحق سزائے موت ہے، لہٰذا غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب نے خلط مبحث کرتے ہوئے، ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق' ذمی کی توہین رسالت کی سزا پر بعض حنفی علماء کی رائے کو اچھالنا شروع کر دیا کہ یہ جرم تو قابل معافی ہے اور اس پر ہلکی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

بھائی! سلیمان تاثیر ذمی نہیں تھا، قانوناً مسلمان تھا لہٰذا ذمی کی معافی کی بحث کی یہاں کیا تک اور اس بحث کو یہاں چھیڑنے کا کیا فائدہ؟ لیکن انہوں نے عین انہی دنوں یہ بحث چھیڑی اور مغرب کے حامی طبقوں اور میڈیا نے اسے خوب اچھالا اور یوں مغرب زدہ 'ماڈرن' اور 'لبرل' مسلمانوں کو عمار ناصر صاحب اور جاوید غامدی صاحب نے دلائل مہیا کیے کہ سزائے موت کا قانون تو بڑا سخت اور انتہا پسندانہ قانون ہے جب کہ فقہاء تو گستاخ کی معافی اور کم سزا کے بھی قائل ہیں اور اس کے لیے یہ اور یہ رخصتیں موجود ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ توہین رسالت جیسے متفق علیہ اور نازک مسئلے پر عمار ناصر صاحب کا خلط مبحث اور مغالطوں کے ذریعے پاکستانی مسلمانوں میں فکری انتشار پیدا کرنے والا کردار خود جاوید غامدی صاحب سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ غامدی صاحب اپنے وسیع دینی مطالعے اور عربی دانی کے باوجود ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں (گورنمنٹ کالج سے بی اے آنرز) اور کوئی مضبوط علمی پس منظر نہیں رکھتے، جب کہ عمار ناصر صاحب حنفی دیوبندی مکتب فکر کے ایک بڑے علمی گھرانے کے فرزند ہیں۔ ان کے دادا مولانا سرفراز خان صفدر مرحوم امام اہل سنت کہلاتے تھے، بیسوں علمی کتابوں کے مصنف تھے اور برصغیر کے دیوبندی علماء میں ایک بڑا مقام رکھتے تھے اور دیوبندی حلقوں میں ان کا اثر ورسوخ مسلمہ تھا اور ہے۔ ایسے علمی گھرانے سے تعلق کی وجہ سے لوگ فطری طور پر عمار ناصر صاحب کی عزت بھی کرتے ہیں اور ان کی بات بھی سنتے ہیں (جب کہ بدقسمتی سے ان کے والد مولانا زاہد الراشدی صاحب بھی 'علمی اختلاف' کا الاؤنس دیتے ہوئے عمار ناصر صاحب کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں)۔

ان حالات میں اگر مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے عمار ناصر صاحب کے موقف کے خلاف یہ

کتابچہ طبع کیا ہے تو یہ وقت کی ضرورت تھا تا کہ اس موضوع کے حوالے سے جو فکری انتشار عمار ناصر صاحب نے (جاوید غامدی صاحب کے ساتھ مل کر) پھیلایا ہے، اس کا سدّ باب ہو سکے اور لوگ اصل حقائق جان سکیں۔ ظاہر ہے مفتی صاحب نے صرف نفس مسئلہ کی علمی جہت کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور عمار صاحب کے موقف کی کمزوری ثابت کی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جس 'شان نزول' اور پس منظر میں عمار صاحب لکھ رہے ہیں اس کا ذکر کیے بغیر پوری بات سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی لہٰذا ہمیں یہ سطور لکھنا پڑیں۔

ہم نہ عمار ناصر صاحب کی علمیت کے منکر ہیں اور نہ ان کے حق اختلاف کے، کہ علمی اختلاف کی گنجائش تو ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسلام اور مغربی تہذیب میں حق و باطل کی جو جنگ اس وقت جاری ہے (اور وہ ہم نے نہیں مغرب نے چھیڑ رکھی ہے کیونکہ اس کی تہذیب غالب ہے اور وہ اسے مسلم معاشرے میں بھی غالب دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگ نام کے مسلمان تو رہیں لیکن اس کی فکر اور تہذیب کو اپنا ئیں) اس میں ہمارا وزن کس کے پلڑے میں جاتا ہے؟ ہم عمار ناصر صاحب اور جاوید غامدی صاحب کی فکر کو اس لیے مبنی بر تجدد اور غلط سمجھتے ہیں کہ وہ دین کی ایسی تعبیرات کو ابھارتے ہیں جن سے مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب اور اسلام و مسلم دشمن مغرب کو کمک پہنچتی ہے، ان کے نقطۂ نظر کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور مسلم معاشرے میں فکری انتشار پیدا ہوتا ہے جو اس کی ایمانی، اخلاقی اور فکری صحت کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازیں (آمین یارب العالمین)۔

کرنا کیا ہے؟

پاکستان کے مفکرین، کالم نگار، علماء، حکماء، شعراء اور دانش ور ہمیشہ مسائل کا رونا روتے رہتے ہیں اور کہانیاں سناتے رہتے ہیں............کوئی ہمیں قابل عمل حل نہیں بتاتا جس پر پوری قوم اتفاق کرے۔ اس کی بجائے قوم کو مزید کنفوژ کر دیا جاتا ہے۔ اس صدی کا عملی، عقلی اور تعلیمی انسان وہ ہے جو اپنے مسائل کا تجزیہ کرے اور ناقدانہ انداز میں سوچ کر اپنے مسائل کا حل تلاش کرے۔ خدارا اب ہمیں کوئی قابل عمل حل بتائیں۔ (ڈاکٹر انعام اللہ، اٹک)

معلومات داخلہ برائے سعودی یونیورسٹی

وہ حضرات جنہوں نے پچھلے پانچ سالوں میں ایف اے یا اس کے مساوی، یا کسی دینی مدرسے سے العالیہ کی سند حاصل کی ہو اور ان کی عمر ۲۳ سال سے زائد نہ ہو، یا پچھلے پانچ سالوں میں بی اے کی سند حاصل کی ہو اور عمر ۳۰ سال سے زائد نہ ہو۔

رابطہ:

پروفیسر ڈاکٹر رانا خالد مدنی (فاضل مدینہ یونیورسٹی، پی ایچ ڈی) سابق مترجم مواجہ شریفہ، مسجد نبوی، مدینہ منورہ، چیئرمین ادارہ اشاعت اسلام لاہور۔ رابطہ: ۰۳۰۶۔۴۴۷۶۰۵۵

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن و حدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز

۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ

	۱۹۔	حقیقتِ تصوف
انگریزی	۲۰۔	Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
	۲۱۔	Noble Quran, Part 1
	۲۲۔	Islamization of Laws in Pakistan
عربی	۲۳۔	السلطةالتشريعية۔دراسةمقارنة